تسنیم سلیم چھتاری
ڈاکٹر رشید جہاں
ز ۔ ب
حمیدہ سلطانہ

عصمت شاہ لطیف
حجاب امتیاز علی
مسز عبد القادر
خدیجہ مستور
صدیقہ بیگم سیوہاروی

3/-

محمل

ہندوستان کی مشہور افسانہ نگار خواتین کے خود پسندیدہ افسانے

موجد بدایونی

ناشر

نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں

بار اول　　　　اگست ۱۹۴۷ء　　　　قیمت سے

مطبوعہ

نظامی پریس بدایوں

(محمد احید الدین پرنٹر و پبلشر)

۹

اُن جاں باز بہنوں کے نام

جنھوں نے آزاد ہندوستان

اور آزاد پاکستان کے

قیام کی جدوجہد میں

جامِ شہادت

پیا!

قید رکھا مرے صیاد نے کہہ کہہ کے یہی
ابھی آزاد کیا بس ابھی آزاد کیا

ترتیب

پیش لفظ

آج کل خواتین لکھنے پڑھنے کے میدان میں خاصا حصہ لے رہی ہیں۔ لکھنے والیوں کی تعداد سنا ہے کافی طویل ہے، خدا کرے پڑھنے والیوں میں بھی کافی اضافہ ہوتا رہے!

ادب کے اکثر شعبوں اور خاص طور سے افسانہ نگاری میں ان کی یہ دلچسپی شگون نیک ہو یا نہ ہو، قابل ذکر ضرور ہے۔ ذاتی طور پر میں ادبی شعور کے حصے بخرے میں مردوں اور عورتوں میں امتیاز کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ اس لئے کہ ادب ہی وہ میدان ہے جہاں ریت رسم کے بندھن، ذاتی اور مقامی ہمدردیاں، معاصرانہ شہرت یا عدم شہرت، اور اسی قسم کی دوسری تمام لہریں وقت کے بڑے دھارے کے سامنے مٹتی غائب ہوتی نظر آتی ہیں۔ ان ہمہ گیر

اُصولوں کی کسوٹی پر جھوٹ یا فریب کا ذرا گزر نہیں اور بقائے دوام صرف اُسی کو نصیب ہوتا ہے جو کھرا اور سچا ہو! اس میں نہ عورت مرد کی تخصیص ہے، نہ بڑے اور چھوٹے کی —— نہ "مقدمے" اور "افسانے" کی!

پھر بھی اس قسم کا مجموعہ جیسا کہ آپ کے پیش نظر ہے، ادبی مورخ کیلئے مختلف پہلوؤں سے مفید ہو سکتا ہے۔ اس میں افسانہ نگار خواتین کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں سے خود ہی انتخاب کریں، اور ساتھ ہی اپنے مختصر سوانح حیات بھی لکھیں۔ یہ مواد دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ کارآمد بھی ہے۔ گو یہ فہرست بڑی حد تک مکمل ہے لیکن پھر بھی اضافہ کی گنجایش باقی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ منتخب مجموعہ ایک اچھی اور قابل تقلید مثال قائم کرے گا، اور دوسرے لوگ اس کام کو آگے بڑھائیں گے۔ اس سے صرف یہی نہیں کہ لکھنے والی خواتین عوام سے روشناس

ہو جائیں گی، بلکہ ہمارے ادبی سرمایہ میں متنوع
اور ایک حد تک حقیقت نگاری بھی آئے گی
انگریزی ادبیات میں وہ خراج ہمیشہ بڑی قدر کی
نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جو والٹر اسکاٹ نے بیشمار
ناولیں لکھنے کے بعد جین آسٹن کے "گھریلو"
ناولوں ان کے مدھم مزاج اور نسوانی فطرت کی
بے لاگ (اور اکثر رقیبانہ بھی) نقاب کشائی
کے حضور میں پیش کیا ہے۔

خوشی اس بات کی ہے کہ اب اردو میں
بھی لوگ عورتوں کی تصنیف کردہ چیزوں کو مذاق
کا شکار بنانے کے بجائے اس کے پیش کرنے میں
فخر محسوس کرتے ہیں۔ اسے میں مردوں کی خاتون
نوازی پر نہیں، بلکہ خود عورتوں کی خود شناسی
پر محمول کرتا ہوں کہ بجائے ہاتھ پر ہاتھ دھرے
اس بات کا انتظار کرنے کے کہ خدا اس قوم کی حالت
بدل دے، انھیں خود اپنی حالت کے بدلنے کا
خیال آچلا ہے خواتین کی اس تعلیمی بیداری سے
ملک میں یقیناً خوشی اور اطمینان کی لہر پھیل
رہی ہے اور مختلف حلقوں اور مختلف شکلوں

ہیں ان کے کام کی قدر کی جا رہی ہے۔ زیر نظر مجموعہ بھی اسی قدر شناسی کا ثبوت ہے۔ اور صرف قدر شناسی ہی نہیں بلکہ مرتب کے سلیقے اور خوش مذاقی کا بھی! اس میں ہمت افزائی اور اعلیٰ حوصلگی دونوں کی جھلک ہے، اور اُمید کی جاتی ہے کہ ادبی حلقوں میں یہ مجموعہ خاصی اہمیت رکھے گا۔ اور فاضل مرتب کی یہ قابل قدر کوشش بہ نظر تحسین دیکھی جائے گی۔

رشید احمد صدیقی

شعبۂ اُردو
مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

عرض حال

عرصے سے اس ضرورت کو محسوس کر رہا تھا کہ اردو کی اچھی لکھنے والیوں کے افسانوں کا ایک ایسا مجموعہ مرتب کیا جائے جو مجموعی طور پر ان کی علمی اور ادبی خدمات کا آئینہ دار ہو۔ ضرورت کا محرک "نگہبانی زن" کا خیال نہیں بلکہ یہ احساس تھا کہ کہیں آج کل کی ادبی جماعت بندی میں طبقہ نسواں کے بعض انمول "رتن" ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں۔

یہ دیکھ کر ایک گونہ اطمینان اور خوشی ہوتی ہے کہ ہماری خواتین اس میدان میں کسی طرح مردوں سے پیچھے نہیں۔ اگر پچھلے بیس سال کے ادبی رسائل کا جائزہ لیا جائے تو سوا سو سے اوپر ایسی لکھنے والیوں کے نام مل سکتے ہیں جو مختلف طریقوں سے اردو ادب کو نوازتی رہی ہیں۔ ان میں کم از کم پندرہ بیس خواتین ایسی ہیں جن کو ادب میں ایک خاص درجہ حاصل ہے اور جن کا ادبی شعور آج کامل طور سے پختہ ہو چکا ہے۔ لیکن افسوس کہ اردو ادب کی جہاں اور بہت سی بد نصیبیاں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ ادب کا یہ پہلو عوام سے بالکل پوشیدہ رہا۔ جو در اصل بڑی حد تک اس کا پشت پناہ تھا ہماری بے اعتنائی

اور بے توجہی سے نہ معلوم کتنی لکھنے والیاں جن کو قدرت نے خاص دل و دماغ اور بہترین ادبی صلاحیتیں ودیعت کی تھیں ہمت ہار کر بیٹھ رہیں، اسکے باوجود خوشی کا مقام ہے کہ بعض خواتین مخالف و موافق ہواؤں کے تھپیڑے کھاتی ہوئی، ستائش کی تمنا، اور صلہ کی کی پروا کئے بغیر نہایت تیزی سے آجتک شاہراہ ادب پر گامزن نظر آتی ہیں۔

فنی نقطۂ نظر سے عورت مرد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ افسانوی صلاحیتیں رکھتی ہے۔ افسانے کے فن سے اس کی فطرت کو خاص لگاؤ ہے۔ مرد کہانی "بناتا" ہے، عورت کہانی "بنتی" ہے، افسانے کے فن کو چونکہ بننے اور کاڑھنے سے خاص مناسبت ہے اسلئے میں اسے عورت کا میدان سمجھتا ہوں۔ خارجی زندگی میں ہندوستانی عورت کا دخل کم ہونے کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ خارجی کوائف کو بیان کرنے میں اُسے پوری کامیابی نہیں ہوتی۔ لیکن جہاں تک ہماری گھریلو زندگی کا تعلق ہے یہ ماننا پڑے گا کہ عورت اُن حقائق کی نقاب کشائی کرتی ہے جو دراصل مرد کی دسترس سے باہر ہیں۔

ادب میں مرد اور عورت کی تخصیص دراصل کوئی معنی نہیں رکھتی۔ لیکن پھر بھی ادب کے اس پہلو کو خاص طور پر اُجاگر کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک طاقتور اکثریت کسی کمزور اقلیت کے افراد کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کرتی ہے، اور انکے حقوق کو جا و بیجا غصب کرنے کی کوشش کرتی ہے تو آخرالذکر کو سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ اکثریت سے قطعًا علیحدہ ہو کر اپنا ایک نیا پلیٹ فارم قائم کرے تاکہ جب تک حاکم اکثریت محکوم اقلیت کے جائز حقوق کو تسلیم نہ کر لے اور اُسے اپنا ہم پلّہ تصور نہ کرے یہ اپنا تمدن ثقافت اور ملیت کو

فنا ہونے سے بچا سکے ادب کو اس کلیہ سے مستثنےٰ تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اگر آپ اس مجموعہ کے افسانوں کا تجزیہ کریں تو ان کو اردو کے دوسرے ممتاز افسانہ نگاروں کی تخلیقات سے کسی طرح کم نہ پائیں گے۔ افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ افسانہ ہوتے ہوئے افسانہ نہ ہو، چنانچہ یہ افسانے اسی خصوصیت کے حامل ہیں۔ فنی بلندیوں کے ساتھ ساتھ اس میں زمانے کے دل کی دھڑکن بھی مل جائے گی اور میری طرح آپ بھی ان کو پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ چلمنوں، دروازوں اور دریچوں سے بھی باہر کی دنیا کا بخوبی جائزہ لیا جا سکتا ہے تجربہ کی کمی تخئیل سے پوری کی جا سکتی ہے۔ اردو افسانے کا مستقبل نہایت تابناک ہے۔ یہ نہایت سرعت سے ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ کاش ہم لوگ اب بھی خواتین کے کام کی قدر و قیمت پہچانیں اور اُن کی مناسب ہمت افزائی کریں۔ تاکہ جلد از جلد عورت اور مرد دونوں کی متفقہ کوشش سے ہمارا افسانہ اس منزل پر پہنچے جس کی آس ہمارے تنقید نگار عرصہ سے لگائے ہوئے ہیں۔

افسانہ نگار خواتین کے انتخاب میں میں نے ان کے ادبی مرتبے کو خاص طور سے ملحوظ رکھا ہے اور صرف انھیں خواتین کے افسانے شامل کئے ہیں جن کے ادبی کارنامے کم و کیف، ہر اعتبار سے مقتدر ہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہ چھوٹی سی فہرست بھی اس طبقہ کی پوری نمائندگی کرتی ہے۔ اس میں آپ "زیر نقاب" بھی پائیں گے اور "بے حجاب" بھی، ترقی پسند بھی پائیں گے اور خود پسند بھی اور انھیں بھی پائیں گے جو عورت ہو کر مردوں سے آگے ہیں!

میری کوشش تھی کہ اس مجموعہ میں حصہ لینے والی خواتین کے وہ افسانے

جو انھیں اپنے تمام افسانوں میں سب سے زیادہ پسند ہیں شامل کئے جاسکیں۔ لیکن دو تین افسانوں کے انتخاب میں بعض وجوہ کی بنا پر میں یہ قید قائم نہ رکھ سکا۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ اس مجموعے کے افسانے لکھنے والیوں کے پسندیدہ افسانے نہ سہی پھر بھی اُن کے مخصوص ادبی محاسن کے ضرور حامل ہیں۔

افسانوں اور خود نوشتہ سوانح حیات کی فراہمی میں جو ناز برداریاں اور انتظار اُٹھانا پڑا ہے وہ واقعی اتنا صبر آزما تھا کہ میں نہ معلوم کب کا اس ارادے کو ترک کر چکا ہوتا مگر میں متشکر ہوں اپنے ان بزرگوں اور دوستوں کا جنھوں نے مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے میری ہمت افزائی کی اور میری یہ ناچیز کوشش روبکار آسکی۔

آخر میں اُن افسانہ نگار خواتین کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا جنھوں نے میری درخواست پر اپنا افسانہ اور حالات مجھے ارسال کئے یا دوسری خواتین کے حالات اور افسانے حاصل کرنے میں میری مدد فرمائی۔ میں اس پر خلوص اعانت کے لئے اُن سب کا تہ دل سے ممنون ہوں ——— یہ جذبہ ممنونیت یہ اظہار تشکر رسمی نہیں قلبی ہے۔

محمد الدین آموجد بدایونی

اگست ۱۹۴۷ء

پیشہ

عصمت شاہد لطیف

عصمت شاہد لطیف

میرے حالاتِ زندگی قطعی اس قابل نہیں کہ فخریہ بتائے جائیں بچپن بھرے گھر میں پٹتے پٹاتے گزرا۔ تعلیم نہایت بے ڈھنگے پن سے ہوئی۔ اُستاد ہمیشہ مکدر خاطر رہے۔ علی گڑھ اور لکھنؤ میں تعلیم مکمل کی، لے دے کے محکمہ تعلیم ہی ہم عورتوں کا آشرم ہے، چنانچہ وہیں پناہ گزین ہوں۔ مطالعہ کا شوق نہایت بے ڈھنگا ہے۔ نہیں پڑھتی تو روزانہ اخبار تک نہیں پڑھتی اور جو پڑھنا شروع کرتی ہوں تو دن رات ایک ہو جاتے ہیں۔ یہی حال لکھنے کا ہے۔ سال میں ایک آدھ بار لکھنے کا دورہ سا پڑتا ہے۔ اور وہ بھی سستی کے زمانے میں جب کچھ کام نہیں ہوتا اور جی گھبرانے لگتا ہے تو لکھتی ہوں اور اس قدر تندہی سے لکھتی ہوں کہ سوچنے کے لئے بھی نہیں رکتی۔ تنہائی میں لکھنے کی عادت نہیں چونکہ کبھی نصیب ہی نہ ہوئی، غدر مچا ہوتا ہے، ریڈیو بجتا ہوتا ہے اور بچے کشتیاں لڑتے جاتے ہیں اور میں لکھتی ہوتی ہوں، یہی وجہ ہے کہ میرے مضامین میں ایک دوڑ سی آجاتی ہے، لشتم پشتم بھاگم بھاگ مچی رہتی ہے۔ شروع زمانہ سے لے کر آج تک ایک مسلسل "چلو چلو"!

مضامین لکھنے کا شوق تو نہیں تھا۔ ایک دفعہ تہذیب نسواں میں اپنی

میٹرک کرنے کی خبر چھپوانا چاہی مگر سب نے کہا کچھ بیوہ فنڈ کے لئے بھیجو تب چھپے گا کچھ۔ چونکہ والد صاحب جیب ناک صرف آٹھ آنہ مہینہ جیب خرچ دیتے تھے۔ لہذا دل پر پتھر رکھنا پڑا۔

سب سے پہلا مضمون بچپن لکھا تھا جو تہذیب نسواں کو بھیجا۔ جب تاک مولوی ممتاز علی صاحب زندہ تھے اُنھوں نے ڈانٹ بتائی۔ یا شاید امتیاز علی صاحب تھے جنھوں نے لکھا کہ اس مضمون میں تم نے تعلیم قرآن کا مذاق اُڑایا ہے۔ لہذا بس ارادہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد "شادی" لکھا۔ ساقی کا علیم بھائی کی وجہ سے بہت زور تھا گھر میں۔ مگر ڈر لگا کہ اتنا اونچا پرچہ بھلا ہمیں کا ہے کو گنتی میں لائے گا۔ خیر ہمت کر کے شاہد صاحب کو نہایت مسکین بن کر لکھا کہ اگر اس قابل ہو تو چھاپ کر ممنون فرمایئے۔ مگر خدارا میرا نام نہ لکھیے گا۔

دراصل مجھے بدنامی کا ڈر تھا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ کس قدر واہیات لکھا ہے۔ پتہ نہیں کیوں اتنی گمنام ہونے ہوئے بھی بدنامی کا ڈر تھا۔ شاہد صاحب نے جو جواب دیا تو بدحواس ہونا پڑا۔

"آپ کا مضمون اچھا بلکہ بہت اچھا ہے میں نے ایک نشست میں ختم کر دیا۔ اسے سالنامہ کے لئے رکھ لیا گیا ہے"

آپ سوچیں گے کہ میرے پاس شاید اب تک وہ خط محفوظ ہے۔ جی نہیں۔ جناب مگر الفاظ ایسے دل پر نقش ہیں کہ بھلائے نہیں جا سکتے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ ماں اپنے پہلے بچے کی پیدائش کبھی نہیں بھول سکتی خواہ خوگیسر کی بھرتی کیوں نہ بھر جائے۔ یہ ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے۔

یہ سوال بھی ذرا ٹیڑھا ہے کہ میرا بہترین افسانہ کون ہے جسے دیکھتی ہوں جی چاہتا ہے کہ کلیجے سے لگا لوں۔ آخر یہ کالے نیلے پیلے سب میرے ہی دماغ کے ٹکڑے ہیں نا۔ پھر میرا دل نہیں چاہتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو چن لوں اور دوسروں کو پرے دھکیل دوں۔ مگر خیر لوگ تو اپنی اولاد کے ساتھ اونچ نیچ کرتے ہیں۔ یہ تو کاغذی غبارے ہیں۔

حالاتِ زندگی کے سلسلہ میں شاید مجھے یہ بتانا پڑے گا کہ شادی کب کی؟ مگر یہ بتانے میں مجھے بہت نقصان کا احتمال ہے۔ کیونکہ حال ہی میں ایک نقاد صاحب نے فرمایا ہے کہ جب سے میں نے شادی کر کے گھر بار چولھا سنبھالا ہے میرے مضامین میں وہ شگفتگی اور زندگی نہیں رہی۔ اگر آپ کو معلوم ہو گیا تو آپ حساب لگا کر نہ جانے میرے کون کون سے افسانے ردی کی فہرست میں داخل کریں گے "شادی بیاہ کے بعد دنیا بدل جایا کرتی ہے" مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ادبی دنیا بھی ان ڈھکوسلوں کی قائل ہے۔ اور وہاں بھی جھٹے بجرے لیتے وقت کنواری بیاہی اور بیوہ کا خیال رکھا جاتا ہے۔

مجھے معلوم تھا۔ وہ سو ٹکا سو طوائف ہیں۔ وہ سرخ مصنوعی بال چھنٹ کپڑے اندرون رات مردوں کے ٹھٹ۔ ناچ گانے اور موٹے مہین قہقہے مجھے اپنے کمرے میں بیٹھے بٹھائے جھکولا کرتے تھے ہم عورتیں بڑے سے بڑے پہلوانوں کو چت کر سکتی ہیں پر جب طوائف سے ٹکر ہوتی ہے تو ساری نسوانیت اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں لوری کے ساتھ ساتھ بچے کے دل میں یہ بات چپکا دیتی ہے کہ طوائف اژدہا ہے، سانپ ہے! کیا کچھ ہے!

اور یہی بچپن کی نفرت اب تک خون کے قطروں میں ناچ رہی ہے ویسے ہزاروں عورتیں گذر جائیں پتہ نہیں چلتا۔ لیکن طوائف کو سونگھ کر ہرن کی طرح ٹھٹک جاتی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ یہ خوشبو پہلی دفعہ میں نے بہت بچپن میں سونگھی تھی بہرائچ میں سید میاں کے مزار پر جمعرات کو طوائفوں کا جمگھٹا ہوتا۔ اللہ کے پیارے

بھی اس متبرک دن کچھ زیادہ ہی آ جاتے۔ ایک دن ایک پکی سی طوائف نے مجھے نہ جانے کس جذبہ کے ماتحت گود میں اُٹھا لیا۔ وہ اُس کے پھسلنے کپڑے اور مخصوص خوشبو میں بسا ہوا سینہ! میں جلدی سے اُس کی گود سے مچل آئی۔

اُس دن مجھے سب نے خوب تھو تھو کر کے چھیڑا کہ ہے بچاری کو رنڈی نے چھو لیا اور میں بھی اُس ہتک کے احساس سے دیر تک روتی رہی۔ پھر ایک دن میری پھوپی آئیں اور اُنھوں نے مجھے پیار کیا تو وہی پھسلتے ہوئے ریشمی کپڑے اور دھکتا ہوا سینہ! نہ جانے کیوں میں فوراً مچل کر بھاگ آئی۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا اور میری رنگین پھوپی شکل سے مہینہ بھر رہی ہوں گی کہ دس بچوں کے باپ میرے ابا جان اُن پر بُری طرح عاشق ہو گئے۔ میری اماں بچاری بجھ کر رہ گئیں۔ بھلا پان بیڑی کی دوکان کے سامنے کوئی شاندار ہوٹل کھول دے تو بچاری دوکان کا جوبن کے دن کا؟ خیر ٹونے ٹوٹکے ہوئے تب جا کر کہیں اُن کے گُردوں میں درد اُٹھا اور وہ بھاگیں۔ ہاں تو میرا مطلب یہ ہے کہ ہم عورتیں طوائفوں کو سونگھ کر ہی کھٹک جاتی ہیں بقول کسے اُن کا ٹھسّا دیکھ کر ہی حفاظتی دیواریں کھڑی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ وہ کوٹھے سے اُتر رہی تھیں اور میں چڑھ رہی تھی کہ میں نے انھیں سونگھ لیا اے ہے یہ میں کہاں آ گئی؟ کیا کہے گی دنیا؟ میرے محکمہ والے کیا کہیں گے؟۔ ایک سے ایک بدمزاج بھرا پڑا ہے۔ محلہ والیوں سے زیادہ یہ محکمہ والے ایسی ویسی باتوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔

عید کا دن تھا غریبی میں کیسی عید اور کیا محرم کپڑے بھی نہ بدلے لیٹی اخبار دیکھتی رہی پڑوسن کے یہاں چار بجے سے برتن کھڑک رہے تھے ان بچاریوں کو

نیاز تازہ کی بڑی فکر پڑی رہتی۔ بستر پہ لیٹی ناشتہ کر رہی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹایا اور قبل اس کے کہ میں سنبھلوں وہ آن دھمکیں!

عام طور پہ کیسے معلوم رہتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے اور میری عمر میں یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی طوائف دندناتی چلی آئی ہو۔ لہٰذا میں گھبرا کر رہ گئی۔

"اے ہے میں نے کہا کہیں تم ناشتہ نہ کر چکو — کیا لشتم پشتم سویاں لگھار رہی ہیں" — وہ اپنے چست کپڑوں میں سے پھنکاریں۔ کمبخت کو یہ بھی سوچنے کی فرصت نہ تھی کہ تنگ کپڑے پہننے کے دن کبھی کے جا چکے تھے اور خمیری آٹے کو تسموں سے کسنے سے نہایت ناہموار سطح ہو جاتی ہے۔

"میں صبح کے وقت مٹھاس نہیں کھاتی" — میں نے غرور سے گرہستن بننے کی کوشش کی۔

"اوئی آج عید کے دن بھی مٹھاس نہیں — بھئی تمھیں ہماری قسم تھوڑی سی ضرور چکھو" — وہ نہایت بے تکلفی سے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

یا اللہ! کیا یہ مجھے بھی طوائف سمجھ کر تبرک کے ذریعہ میرے گناہ دھونے آئی تھیں۔ اب یہ کیسے بتاؤں کہ ہم قطعی نیک اور پارسا ہوں اور پھر قسم! اوہ معبود یہ وہی تو اس کے ہزاروں عاشقوں کی چھوڑی ہوئی قسم تھی جو یہ میرے حلق میں ٹھونس رہی تھی! میں جل اٹھی۔ لیکن جب وہ بے حیائی سے مصر ہی ہو گئیں تو میں نے دو چمچے چکھ لئے۔

"باورچی نے کہا کہ یہ بیوی مسلمان ہیں — بس میرا جی ملنے کو پھڑک رہا تھا ... مگر تم تو سارا دن غائب رہتی ہو" — کسی نے انھیں پکارا اور

وہ چلی گئیں۔

میں نے دو چمچے اور کھائے! یا خدا! جی چاہا حلق میں انگلی ڈال کر قے کردوں یہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں طوائف کی کمائی کھا رہی تھی۔ عصمت فروشی کی جمع کی ہوئی گھناؤنی دولت۔ فاحشہ بدکار کا پیسہ؟

مگر پھر میرے دل میں نہایت بے شرمی کے باغیانہ خیالات ناچنے لگے یہ رنڈی کا پیسہ کبھی تو اپنے باپ دادا ہی کا پیسہ ہے میرے ایک چچا تھے جنھوں نے تین ہفتہ میں تیس ہزار روپیہ رنڈی بازی میں اڑا دیا تھا۔ اس سے مجھے کیا کہ میری چچی رنڈی کون تھی۔ ان لال بالوں والی ہی کی کوئی بہن بھانجی ہوگی میں نے اور شوق سے سویاں کھانی شروع کیں۔ جیسے میں پھنکا ہوا مال سمیٹ رہی تھی۔ مجھے ایک قسم کا اطمینان سا مل رہا تھا۔ میں ایک امیر کو کچھ تھوڑا سا غریب بنا رہی تھی۔ ایک چمچہ اور لیا اور میرا منہ کیوڑہ اور میوہ میں گھلی ہوئی سویوں سے بھر گیا۔ ایک بڑا سا سالم پستہ میری داڑھ کے نیچے پچ سے آ گیا۔ چکنائی کی ننھی ننھی بوندیں منہ میں پھدکنے لگیں۔ جیسے میں نے کسی موٹے سے بنیئے کو چبا ڈالا۔ مگر فوراً ہی مجھے اس کی چربی کے خیال سے ابکائی آ گئی مجھے وہی اطمینان محسوس ہو رہا تھا جو انگریزی کپڑے جلاتے وقت بلوائیوں کو ہوتا ہے ہماری انتقام پسند آنکھیں ان خالی خولی کپڑوں میں اپنی مرضی کے موافق تخیلی جسم دیکھ کر سکون محسوس کرتی ہیں۔

میں نے سرہانے کی میز سے میٹرک کے امتحان کی کاپیاں اٹھا کر دیکھنا شروع کیں۔ کیسی عید اور کیسی بقرعید۔ ابھی تین سو کاپیاں اور دیکھنا تھیں۔ مگر میرا

دماغ جب بھٹکنا شروع کر دیتا ہے تو ٹھہرا گھیروں پکڑ میں نہیں آتا۔ جل کریں نے کئی بدقسمتوں کو نیل کر دیا۔ پھر کاہیاں دور چھینک کر انگڑائیاں لینے لگی۔ یہ یہاں کی آب و ہوا بھی کیا عجب ہے جیسے بڑے سے گیلے تولیہ میں فضا لپٹی اونگھ رہی ہے، تھکی تھکی نیند، اعضاء بھاری اور پھسلنے جیسے کسی نے سریش لگا کر ہلکا سا سکھا دیا ہو۔ ایک جھلایا ہوا سڑوسا — اور پھر پڑوسن کے یہاں سے قہقہوں کے گرم گرم بھبکے!

بدنصیب! مجھے پڑوسن پر رحم آنے لگا۔ ممکن ہے غریب اپنا جوہر عصمت لٹانے پر مجبور ہو گئی ہو۔ شاید کسی ظالم نے اس کی عزت لوٹ لی ہو۔ اور پھر وہ کھسیا کر سر بازار بکھیرنے لگی اور مجھے اس پر پیار آ گیا۔ جب کبھی ہم سب بچے اماں سے کوئی کھانے پینے کی چیز چھیننے لگتے تو وہ بھی کھسیا کر ٹوکرے کا ٹوکرا پٹخ دیتی تھیں — کہ "لو نامرادو بھکسو — اپھرو گے —"!

لیکن ہمیشہ نیک خیال کے ساتھ بد خیال ضرور میرے دماغ میں لگ آیا کرتا ہے اور جونہی بچارا نیک خیال اونگھا بد نے پھن اٹھایا۔ یقیناً یہ سرخ بالوں والی طوائف جان بوجھ کر شوقیہ بنی ہوگی۔ سستی کے مارے اور دنیا کا کچھ کام نہ ہو سکا — مزے سے یہ پیشہ اختیار کر لیا اور ہاں کیا؟ بھلا پڑوسن سے کیا سلائی ہوتی یا چکی پستی۔ سو جھمیلے ہیں دنیا کے اور پخیڑوں ہیں — میاں بیوی بچے ساس نند کی تو تو میں میں بھلا کون بھگتے — بھلا یہ جوبن قائم رہتا جو پڑوسن کے بھی نو چار ساس نندیں ہوتیں — توبہ کیجئے!

ایک دن جیسے ہی فلیٹ پہ پہنچی۔ پڑوسن کے یہاں کسی کے چیخنے چلّانے

نی آ دا نہ آئی۔ سارے دن کی تھکن اُس پر گھڑی بھر کو چین نہیں۔ اسکول سے آکر جب تک کئی گھنٹے مردے کی طرح نہ پڑے رہو، تھکن نہیں اُترتی۔ معلوم ہوتا ہے کلاس میں لڑکیوں نے بھیجے کو گنے کی گنڈیری کی طرح مزے لے لے کر چبایا اور تھوک دیا۔ بڑی مشکل سے اس چوسی ہوئی گنڈیری کو تازہ کیجئے۔ صبح پھر وہ نکیلے دانتوں کے گھستے! سال میں ۲۴۰ دن یہی عمل جاری رکھیے۔ اُس کے بعد — اس کے بعد پھر وہی چوسی ہوئی گنڈیری کا پھوگ۔

دروازہ کھلا اور وہ ایڑیاں ٹھمکاتی چلی آئیں آتے ہی گرجیں۔

"میں تو عاجز آ گئی ہوں نگوڑے سے — اللہ جانتا ہے ایسی بھی کیا اسکول کی پڑھائی کہ ناس لگ گیا۔"

"اونہہ! نگوڑی باندیوں کی لڑکیوں کے بھی ناس اس قدر ذی حس ہوتے ہیں کہ مر سکیں خوب تو آپ بھی چلیں اعتراض کرنے!"

"تو کیوں بھیجتی ہیں اسکول — اٹھا لیجئے۔"

"اوئی اُٹھا لوں؟ — لو اور سنو — اے بی آج کل بے پڑھی لکھی کو کون پوچھتا ہے — آج کل تو بس گٹ مٹ کرتی بہو چاہیئے۔"

یہ مجھے آج معلوم ہوا کہ اس پیشے میں بھی تعلیم یافتہ ہونے کی ضرورت ہے، شیکسپیئر اور ورڈس ورتھ کے حوالوں کی بھی ضرورتیں آتی ہیں۔

"بات کیا ہوئی؟"

"اے وہ میں نے کہا بیٹی نگوڑی آج کھڑا پاجامہ پہن لو — کہ نہیں — جو بات ہے نہیں — بس وہ موئی فراکیں چڑھا لو — میں نے کہا تم سمجھاؤ تو

شاید مان جائے۔ بات یہ ہے کہ کچھ لوگ دلی سے آرہے ہیں ۔۔۔ انھوں نے رازدارانہ انداز میں کہا اور میرا جی چاہا کہ ان کا چقندر جیسا منہ کھسوٹ لوں۔ جی؟ یعنی میں سمجھاؤں؟ خوب تو گویا پی۔ٹی میں رنڈیوں کی لڑکیوں کو پیشہ کے ہتھکنڈے ہی سکھائے گئے تھے۔ اب بھلا بتایئے یہ کیسے سکھاؤں کہ بھئی دلی والوں کے لئے پاجامہ پہنو، کلکتہ والوں کے لئے ساڑھی اور لاہور والے شلوار پسند کرتے ہیں خوب! اور دوسرے مجھے یہ نگار والی سرے سے بری لگتی تھی۔ یعنی یہ کیا۔ یہ ہندو مسلم اتحاد یا فساد کا نمونہ ہے یا کیا؟ بڑے بڑے لیڈر چت ہو گئے اور یہاں ایک محترمہ کی تجارت پسندی نے ہندو مسلم سب کو گڈمڈ کر کے رکھ دیا۔ مگر یہ میری عادت ہے کہ میں ہمیشہ ہر شخص کو مجبور سمجھ لیتی ہوں۔ شاید لال بادل والی سیٹھانی بھی مجبور ہی ہو گئی ہوں۔ گڑبڑ میں یاد نہ رہا ہو اور بجائے کسی کی حق تلفی کرنے کے انھوں نے دونوں ہی کا خیال رکھا ۔۔۔ خیر!

"تم کبھی ہماری طرف نہیں آئیں" ۔۔۔ انھوں نے ڈھٹائی سے کہا۔ قبل اس کے کہ میں روکھا جواب دوں بولیں "نگار نے نئے توڑے سیکھے ہیں"

اگر مجھے کسی وقت رنڈی پر پیار آتا ہے تو اس وقت جبکہ وہ ناچ رہی ہو۔ اس وقت وہ مجھے عین بین اس محنتی مزدور کی طرح معلوم ہوتی ہے جو پیٹ کی خاطر سرمایہ داری کے کولھو میں بیل کی طرح جتا ہوا ہو یا جیسے کوئی گرہستن چکی پیس رہی ہو۔ رقص کرنا مذاق نہیں۔ بوٹی بوٹی ہل جاتی ہے جیسے دس سیر اناج پیس لیا ہو۔ مگر مجھے طوائف کی زندگی کے دوسرے رخ سے گھن اس لئے نہیں کہ وہ کچھ مختلف ہے بالکل نہیں ۔۔۔ بلکہ ۔۔۔ یا کچھ ضرورت سے مشکل ہے ۔۔۔ یہ بات نہیں ۔۔۔ بلکہ یونہی۔

دوسرے دن ہمت کر کے میں سیٹھانی کے فلیٹ میں چلی ہی گئی کہ دیکھوں اندر سے ان لوگوں کے گھر کیسے ہوتے ہیں۔ اُف وہ بس یہ سمجھ لیجئے کسی چھوٹے موٹے راجہ یا وزیر کا گھر —— قد آدم تصویریں —— برہنہ عورتوں کے مجسمے —— یہ طوائفیں ننگی عورتوں کی تصویریں بھلا کیوں اپنے گھر میں رکھتی ہیں —— بھلا اس سے کیا فائدہ سیٹھانی تو شاید اپنے جسم کی بھیانک سلوٹوں کو ان سڈول مجسموں کی آڑ میں دکھانا چاہتی ہے —— ہوگا کوئی گُر ان لوگوں کا!

نگار مجھے دیکھ کر ایسے شرمائی۔ گویا ابھی انڈا کھٹکا کر باہر نکلی ہے اور بڑی دیر تک نخرے کرنے کے بعد آئی سیٹھانی نے ڈانٹا تو پھر ریکارڈ لگا کر ناچنے لگی

یہ رنڈیاں! اُف میں نے تو سنا تھا کہ ان کے جسموں کو گھن لگ جاتا ہے۔ مگر سیٹھانی تو لوہے کی لاٹھ رکھی تھیں اور اولاد تو خدا کی پناہ —— کیا پھرتیلا لوچدار جسم، جیسے ناگن انگڑائیاں لے رہی ہے۔ جب کلائی پہ کلائی کی گرہ باندھ کر وہ پنجوں سے توڑے لیتی تو اُس کی ننھی ننھی ٹھوکروں سے ساری دنیا ہلکورے لینے لگتی۔ میرا دل لرز اٹھا۔ اف یہ ناگن نہ جانے کتنوں کو ڈسے گی۔ نہ جانے کتنے تندکار بھپیلے میں ٹھونسے گی۔ ویسے تو عورت دوسری عورت سے وقت بے وقت جل ہی جاتی ہے مگر طوائف سے تو خدا کی پناہ —— ! عورت تو اپنا حصہ یعنی ایک مرد لے کر بازار سے ہٹ جاتی ہے۔ مگر طوائف سے تو چھٹکارا نہیں جیسے دکان سے اناج لیتے وقت عوام تو حسب ضرورت لے کر ہٹ جاتے ہیں مگر خاص لوگ بھر بھر بورے تہ خانوں کے کلیجے میں اتار دیتے ہیں۔ نتیجہ ؟ —— اگر اکنومکس پڑھی ہے تو بس سمجھ لیجئے اناج کی کمی! تو یہ ہماری جنگ آج طوائفوں سے چلی آ رہی ہے یہ بھی مزیدار

اور سرمایہ دار کی جنگ ہے۔ دکھ جھیلیں بی فاختہ اور کوے میوہ کھائیں۔ کہتے ہیں۔ ایک دن ایسا دیکھتا ہوا آئے گا کہ سارے مزدور سرمایہ داروں کو پیس کر پھینک دیں گے اور اُن کا سارا سرمایہ چھین لیں گے۔ شاید عورتیں بھی اسی طرح حملہ کر کے ایک دن طوائفوں کا "سرمایہ" چھین لیں! شاید!

شام ہوئی تو گاہک آنے لگے ——— مارے شرم کے میں سکڑی ایک طرف کو بیٹھی رہی کہ موقع ملے تو اڑوں۔ کہیں یہ مجھے بھی اُن میں سے ایک نہ سمجھ لیں اور یہی ہوا کہ ایک بجھے ہوئے سے ایڈیٹر صاحب اُنھوں نے میرے سر چپکا دیئے۔ کمبخت میں کچھ بول بھی نہ سکی اور اُس نے میرا سودا بھی کر دیا۔

تھوڑی سی دیر میں پورا ہال بھر گیا — رنگین عورتیں اور عیاش مرد زور زور کے قہقہے چلنے لگے — ایک کونے میں چار چھ نے بیٹھ کر پینا اور جوا شروع کر دیا دوسری طرف نگار گھرے ہیں اِدھر سے اُدھر چہک رہی تھی۔ اُس پر لوگوں کی خاص توجہ تھی۔ ایک ادھیڑ سا مرد تو اُسے گود میں گھسیٹے لیتا تھا اور وہ ہنس ہنس کر اینٹھی جا رہی تھی۔

گر سماں تو سبھانی نے باندھ رکھا تھا۔ گہرے رنگ کے بھڑکدار کپڑے جو دن کو بے تکے لگ رہے تھے اُس وقت بہار دے رہے تھے۔ پاؤڈر سرخی سے لیس جیسے چوتھی کی دلہن دو چار کمسن لڑکوں میں گھری ہوئی نازک نازک چھیلیں کر رہی تھیں اس وقت بلا کی کمسن اور حسین معلوم ہو رہی تھیں۔ میں سمجھ بیٹھی تھی کہ جوانی عمر سے ہوتی ہے یا اداؤں سے۔ اور ادھر وہ ایڈیٹر صاحب بیٹھے مجھے چبا رہے تھے۔ انتہائی ترقی پسندانہ باتیں اور اس خوبصورتی سے کہ میں ہکلا ہکلا کے رہ جاؤں

ان کی پوری توجہ اُن برہنہ تصویروں کی طرف تھی جو میرے بہت ہی قریب ٹنگی تھیں بلکہ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے ہی جسم پر چپکی ہوئی ہیں۔ بار بار وہ انگلیوں سے ایسی تصویروں کے خطوط چھو کر اُن کے حسن و قبح پر بحث کر رہے تھے۔

جس کے جواب میں گھبرا کر مجھے اپنے بٹوے میں کوئی نہایت ہی ضروری چیز ڈھونڈنا پڑتی تھی۔ گھما کر پھرا کر وہ عورتوں کے سینوں کے ادق مسئلہ پر لے آتے تھے۔ اور آنکھوں میں میٹھی میٹھی نمی پیدا کر کے اپنے سوکھے ہاتھوں سے سانچے ڈھال ڈھال کر تشریح کر رہے تھے۔ باوجود اس قدر ڈھیٹ ہونے کے کئی دفعہ مجھے قالین کے نقش و نگار گھورنے پڑے۔ ہر جنبش پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے جسم کو آٹے کی طرح خوب پیروں سے گوندھ کر بھیانک کا سا پتلا بناتے ہیں پھر بگاڑ دیتے ہیں۔ انھیں مجھے اس طرح پکڑنے میں کچھ مزا آ رہا تھا۔ کیونکہ وہ برابر مسکرا رہے تھے۔ جل کر کئی دفعہ جی میں آیا کہ اُن کے بھی کسی حصۂ جسم کا ایسا مذاق بناؤں کہ ایک دفعہ تو غلیظ مسکراہٹ سے بھری آنکھ بھی جھینپ جائے مگر تہذیب نے زبان پکڑ لی۔

موقع پا کر میں لپکی اپنے کمرے کی طرف۔ گیلری میں ایک نوجی نوجوان نگاہ کو بُری طرح بھنبوڑ رہا تھا اور وہ اوں اوں کر کے اُسے کھسوٹ رہی تھی۔

پلنگ پر لیٹ کر نہ تو نیند ہی آئی اور نہ ہی کچھ کام ہو سکا۔ دوسرے دن انسپکٹرس آنے والی تھی۔ مجھے اس کو دکھانے کے لئے سو سو بناو کرنا تھے سبق موثر ہو انداز گفتگو مرعوب کن۔ لباس سادہ اور چال ڈھال میں نرمی آمیز دبدبہ —— جماعت کی توجہ بورڈ کا استعمال —— سوال و جواب کی اہمیت ——

میرے معزز پیشے کے شریفانہ گر لٹے پٹے میں یونہی ورزش کرنے لگی۔ پھر ایک
دم مجھے خیال آیا جو کوئی مجھے اس طرح دیکھ لے تو کسی کی موجودگی کے خیال سے
مجھے ایک دم تنہائی کا شدید احساس ہونے لگا۔ میں کتنی اکیلی ہوں سوائے اُن قہقہوں
کے جو مہیب چٹانوں کی طرح سیٹھانی کے فلیٹ سے لڑھک لڑھک کر میرے
دماغ سے ٹکرا رہے تھے۔ گھنگھروں کی جھنکار اور تالیوں کی آوازیں ایکبارگی
میرے جسم میں رینگ کر ہزاروں نبضوں کی طرح پھڑپھڑانے لگیں اور پھر بدی
نے دماغ میں کروٹیں لینا شروع کیں ....

اگر ان کروٹوں کا ایک رخ بھی کسی کو دکھائی دے جائے تو —— تو نہ جانے
کیا ہو۔ میں اسی خوف سے لرزا کرتی ہوں۔ مثلاً یہی کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے سیٹھانی
بن سنور کر اپنے گاہکوں کو پیٹ کی خاطر لبھاتی ہیں —— میں بھی کیل کانٹے
سے درست ہو کر اپنے گاہکوں کے دربار میں جاتی ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ میری
عقل —— وہی چوسی ہوئی گنڈیری —— اور سیٹھانی — یعنی مخمل میں کا گھڑا ——
میں دماغ بیچتی ہوں اور سیٹھانی جسم! اور میرے دماغ کا مول سیکنڈ ہینڈ ٹائر کے
برابر یعنی ستّر روپیہ اور سیٹھانی اپنی ایک انگڑائی میں اتنا کما لیتی ہیں کہ میرے
ابّا حکومت برطانیہ کے اعلیٰ افسر ہونے کے باوجود ساری عمر میں نہ کما سکے!
ہم دونوں ہی بازار میں اپنے اپنے خوانچے لگائے بیٹھی ہیں۔ مال مختلف مگر مقصد وہی
میرے مرجھائے ہوئے دماغ کی حیثیت اُن کے وسیع جسم کے آگے ایسی ہی ہے
جیسے پان بیڑی کی دکان کے آگے کرکٹ کلب۔ یقیناً میرا سودا بیکار ہے اور میں جلنے
لگی اپنے تخیّل سے بھڑکائی ہوئی آگ میں۔ لوگوں کو طوائفوں پر رحم آتا ہے

اُن کے سدھار کی فکر میں ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ نائب ہو جائیں — نہیں بلکہ جو بڑے ہی گت سے ہیں اُن کے دن پھر جائیں۔ اُن کے میلے کپڑے زرق برق ہو جائیں۔ شہر بسے گندی نالیوں کے پاس جو مکان ہیں وہ میرین ڈرائیو پہ پہنچ جائیں گاہک آئیں مگر نہ اتنے کہ اُن کا جی میلا ہو جائے اور یہاں تنخواہ کا گریڈ ہر سال گر جائے، کچھ پرواہ نہیں۔ طالب علموں یا دوسرے لفظوں میں دوزخ کے دروغاؤں کی تعداد گھٹتی جائے ہیڈ معلمہ چوس ڈالے۔ دفتر کے کلرک بھنبھوڑ ڈالیں۔ کمیٹی کے ممبر ڈکار جائیں — کچھ پرواہ نہیں۔ استانیاں بچوں کے دماغ بنا رہی ہیں۔ اور طوائفیں لاوارثوں کے دل کی ٹھنڈک — دونوں ہی اپنا اپنا کام کر رہی ہیں۔

پھر — پھر یہ کیوں؟

جب رات اتنی دماغی کشتی لڑی ہو تو انسپکٹرس کے سامنے کیا ناز و ادا چلیں۔ نتیجہ یہ کہ اس سال جو مستقل ہونے کی اُمیدیں تھیں رخصت! جو مسلسل جبہ فرسائی کا ارمان تھا ختم! اُف جس نے اپنی زندگی ہی قوم پر قربان ہونے کے لیے وقف کر دی ہو...... وہ...... مگر قوم ان ادھڑی گابوں سے گھن کھا چکی ہے — یہ بیمار بکریاں — ان سے قوم کو نفرت آتی ہے!

دوسرے دن سیٹھانی پھر آن پہنچیں — اور مجھے ایسے نصیحت کرنے لگیں کہ گویا میں بھی اُن کے پڑوس کی ہوں اور اندھا دھند زندگی گزار رہی ہوں۔

”تو یہ بس ہر وقت پڑھنا — اللہ مارا دماغ بھی ہل جاتا ہوگا۔“

میں مسکرا کر چپ ہو رہی۔

”دیکھو تو کیا شکل نکل آئی ہے“۔ اُنھوں نے رحم کھانا شروع کیا اور میرے

دل میں بغاوت کا بھوت ناچا۔ یہ مجھے کیوں چھیڑتی ہے خواہ مخواہ۔ یا اللہ یہ میں کہاں آگئی؟ اوپر سے تو یہ عمارت بالکل شریفوں کے رہنے کی معلوم ہوتی ہے بورڈ پر نام بھی شریفوں جیسے ہیں! مس کوٹینو...... مس واکر.... مسز عبداللہ مس رشیدہ...... مسز....

"وہ جیمس صاحب تم سے پھر ملنے کو کہتے تھے" ۔ یہ وہی ایڈیٹر صاحب تھے! ارے تو کیا اس نے واقعی مجھ سے پیشہ کرانے کا فیصلہ کر لیا؟ یعنی اپنے گاہکوں سے مریل مریل چھانٹ کر مجھے دیتی جائے گی۔

"بھئی آج تمہیں ضرور سنبھالے کر جاؤں گی" — وہ اٹھلائیں

"مگر مجھے تو —" واضح رہے کہ میرا پیشہ باعزت ہونے کے علاوہ کافی محنت طلب ہے۔

"ارے ہٹاؤ بھی تمہیں تو ہر وقت کام ہی رہتا ہے جیمس صاحب تمہارے لئے خاص طور پر پاس لائے ہیں اور تم ہو کہ ٹال رہی ہو — ارے یہی تو ہنسنے بولنے کی عمر ہے"

یا مولا — تو اب میرا مہذب پیشہ ختم اور یہ "ہنسنے بولنے" کا پیشہ شروع — توبہ اگر میری اماں بچاری کو معلوم ہو تو کیا حال ہو اُن کا — کہ ان کی نیک بیٹی کو بہکایا جا رہا ہے اور یہاں تو سودے بھی ہو گئے۔ آج پاس آ گئے کل نہاری ساڑھی، پرسوں ہیرے کے بندے اور اترسوں وہ خود مرا اپنے مصورانہ خیالات کے۔ اور وہ پھر اُن کے وہ کھردرے سوکھے ہاتھوں سے سانچے بنا بنا کر... ...... اللہ!"

میں نے رکھائی سے انکار کر دیا اور وہ مضمحل سی بڑبڑاتی چلی گئیں۔

"توبہ ایسا بھی کیا —— جبھی تو کہتے ہیں اتنا پڑھانا لکھانا اچھا نہیں لڑکیوں کا —— "

جی ہاں! کیوں نہیں —— پڑھ لکھ کر کر بن گی ہی کیا —— آپ کا لطیف پیشہ سلامت رہے۔ کیا ضرورت ہے کہ دماغ پچی کرے کوئی؟ میری سمجھ میں نہ آیا کہ باوجود اتنی بدمزاجی کے مجھ میں کیا دلچسپی تھی جو بار بار پڑوسن آتی تھیں۔

میں کاپیاں درست کرنے لگی۔ یا خدا یہ فیل ہونے والے بھی جان جان کر جلاتے ہیں۔ جی چاہتا ہے صفر سے بھی کوئی ذلیل تعداد ہو تو وہ نکال کر دوں انھیں مریں کمبخت۔ جی چاہا جو فیل نہیں ہوئیں اُن کو بھی فیل کر دوں —— تاکہ سب کی سب سیٹھانی کی طرح تباہی کے غار میں گر پڑیں۔ پھر ایک دم سے میں نے سوچا نہیں —— یہ تو عجیب سزا ہوگی —— بہتر یہی ہے کہ میں انھیں اپنی طرح قوم کی خدمت کے لئے باہمت اور محنتی اُستانیاں بنادوں —— تاکہ —— تاکہ —— وہ بھی......... آگے سوچنے کی طاقت زنگ آلود ہو کر رہ گئی۔

سیٹھانی اور نگار ہنستی کھلکھلاتی حمید صاحب اور دوچار اور تھکے ہوئے عاشقوں کے ساتھ سنیما گئیں۔ جب وہ آئیں تب بھی میں جاگ رہی تھی۔ جہاں غنودگی آئی اور عفریتوں نے دانت نکال کر حملہ کیا۔ بھلا اس طرح کون کام کرسکتا ہو دوچار دن اور یہی زندگی کے پڑوس میں تو نہ جانے کیا ہو۔ میرے خیالات دن بدن اُلجھتے جا رہے تھے۔ خود اپنے ضمیر سے بات کرتے ڈر لگتا تھا کہ نہ جانے کب کمبخت کیا بول اٹھے۔

میں سر پکڑے پلنگ پر بیٹھی رہی — تھکی ہاری سیٹھانی سو گئی تھی —
فلیٹ پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چند بو العجبانہ خیالات دل میں جھانکے —
فوراً ڈھیل دی تو دیلا کا ریلا ٹوٹ پڑا — قہقہہ پر قہقہہ میرے دماغ میں سے
اُبلنے لگا مگر میرا چہرہ نہ ہنسا .... عزت پاکبازی ..... گندے انڈے
کی طرح پوٹے کے نیچے دبائے بیٹھے رہو ..... تو کیا اس میں سے سرخاب نکلے گا؟
اور پھر تماشہ یہ کہ کوئی بھی اس گندے انڈے کی سیوا کا پھل نہیں دیتا —
قوم کو ذرا بھی احساس نہیں — کہ ایک دیوی یوں پارسائی کا پٹارہ اُٹھائے
تو یہ جی چاہا اُٹھا کر بیچ سٹرک پر ایسی جگہ پھوڑ دوں کہ ہر آنے جانے والا غلاظت
سے لتھڑ جائے۔ یہ مجھے کیا ہو رہا تھا — یہ سب اُس رنڈی کے پڑوس میں رہنے
سے ہوا! مجھے فوراً اپنی سہیلی بینا یاد آگئی! اُف بینا کتنی حسین اور چلبلی تھی۔ اور وہ
پھر مسلسل نو سال پڑھاتی رہی ...... اور پھر ایک دن بوکھلا کر اُس نے
ایک غلیظ بڈھے سے شادی کر لی ...... وہ تو کہتی تھی کہ وہ اُس کی قومی خدمات
کو دیکھ کر اُس پر عاشق ہو گئی تھی وہ سولہ برس جیل کاٹ کر آیا تھا اور کسی زمانے میں
حسین بھی تھا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ بینا قوم کی خدمت کی آڑ لے رہی ہے۔ جیسے سیٹھانی
برہنہ تصویروں کی آڑ لیتی ہے — دراصل بھوک میں کواڑ پاپڑ
ہو جاتے ہیں۔

میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ فلیٹ بدل دوں گی۔ ورنہ جوہر بے بہا کیچڑ میں
جا پڑے گا اور وہ دولت جس کے پیچھے مشرقی عورت جان دے دیتی ہے۔ مٹی
میں مل جائے گی۔ دنیا میں عورت کے پاس یہ عصمت ہی تو ایک شے ہے جسے کوئی

کوئی پیٹ کی خاطر لٹاتی ہے تو کوئی اس کی خاطر جان لٹا دیتی ہے لے دے کر بھی ایک تو پ کا اکہ ہے جو بھروائوں پر مار سکتی ہے۔

تھک ہار کر خیالات میں الجھی سونے کی کوشش کرنے لگی۔

صبح اٹھ کر میں جب نیچے جانے لگی تو سیٹھانی پھل والے سے کھڑی الجھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر غیروں کی طرح منہ پھیر لیا۔ فخر سے میرا سر اونچا ہو گیا آخر کو اُسے معلوم ہی ہو گیا کہ میں شریف ہوں ——— اور وہ بازار کی جنس۔

اس کے دو چار دن کے بعد کا ذکر ہے کہ میرے ماموں زاد بھائی اور اُن کی بیوی آئے — ۔ جب سے میں نے یہ فلیٹ لیا تھا میں ڈر رہی تھی کہ وہ شاید یہ سن کر چراغ پا ہوں کہ میں ایسے پڑوس میں رہتی ہوں جیسے ہی وہ آئے سیٹھانی کے فلیٹ سے قہقہے بڑی بڑی چٹانوں کی طرح لڑھک کر گرنے لگے — میں نے اُٹھ کر نفرت سے دروازہ بھیڑ دیا۔

"کمبخت ہر وقت بدتمیزیاں ہوتی رہتی ہیں"

"کہاں ؟"

"یہاں —— کمبخت ایک طوائف رہتی ہے ۔ —— ہر وقت ٹھٹ لگے رہتے ہیں۔"

"طوائف ؟ —— یہاں ؟ —— مگر یہ تو بگھار کی آواز تھی ——"

وہ چونکے

"ہاں — آپ جانتے ہیں انھیں —— ؟" میں نے معنی خیز نظروں سے

ان کی بیوی کو دیکھا

ہاں ہاں بھئی ـــــ ارے تم نہیں ملیں ان سے ـــ میں نے تو نگارہ کے "ماسلز کا آپریشن کیا تھا ـــ ارے یہ تو بڑے خاندانی لوگ ہیں؟"

"یہ ـــ یہ ـــ سیٹھانی ـــ"

"ہاں بھئی ـــ سیٹھ عبداللہ کی بیوی ـــ سر عبدالکریم کے خاندان میں سے ہیں ـــ اور دلی کی ہیں اُن کی بیوی ـــ چشتیوں کے خاندان کی ہیں ـــ اور ـــ رضیہ کی خالہ لگتی ہیں ـــ"

"ممانی"۔ رضیہ بولیں۔

اور میں حیرت زدہ ان عبرتناک زلزلوں کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ سن ہو گئی ـــ جیسے میں نے کسی مقدس کتاب کو ٹھوکر مار دی ہو ـــ اور کفارہ؟ ـــ کفارہ میرے امکان سے باہر ہو

"تو ـــ تو وہ کوئی دوسرا فلیٹ ہوگا ـــ میں نے ہکلا کر کہا۔

نارنگی کی کلیاں

حجاب امتیاز علی

حجاب امتیاز علی

آپ سید محمد اسمٰعیل (مرحوم) انڈر سکریٹری اعلیٰ حضرت حضور نظام کی صاحبزادی اور ہندوستان کے مستند ترین ڈرامہ نگار جناب سید امتیاز علی صاحب "تاج" بی۔ اے۔ کی اہلیہ محترمہ ہیں۔

حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ ذوق ادب آپ کو اپنی والدہ محترمہ عباسی بیگم صاحبہ (مصنفہ زہرا بیگم) سے ترکے میں ملا۔ ابتدائی تعلیم کانونٹ میں اور اس کے بعد دینی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ ۳۰ مارچ ۱۹۳۴ء کو تاج صاحب سے آپ کی شادی ہو گئی۔

۱۹۳۶ء میں (یعنی ترکی کی مسلمان مشہور ہوا باز خاتون صبیحہ خانم سے بھی پہلے) آپ نے ہوا بازی کا لائسنس "اے" حاصل کیا۔ بہر حال اگر دنیا میں نہیں تو کم از کم سلطنت برطانیہ میں آپ پہلی مسلم ہوا باز خاتون ہیں۔ نغمۂ موت۔ ادب زریں۔ میری ناتمام محبت اور دوسرے رومان۔ لاش اور دوسرے ہیبت ناک افسانے، صنوبر کے سائے اور دوسرے رومان، خلوت کی انجمن، ممی خانہ اور ظالم محبت آپ کی مشہور تصنیفات ہیں "تحفے اور دوسرے شگفتہ افسانے" پر پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے آپکو ادبیات کا اول انعام مل چکا ہے۔ آپکا اسٹائل ہندوستان کے تمام ادبا سے انوکھا اور خوبصورت ہے۔ اس قدر خوبصورت کہ بعض اوقات آپ کی تحریر پر نثر کی بجائے نظم کا گمان ہونے لگتا ہے۔

"از شمع حرم"

میری عمر چھ سال کی تھی اس وقت میرے والد نے مجھے اور میری بوڑھی انا کو ناتس کو لے کر ایک سمندری سفر کیا تھا۔ دراصل یہی سفر ہمارے اور ہمارے دوست لفٹنٹ کرنل جانہ ب آئی۔ ایم۔ ایس۔ کے دوستانہ تعلقات کا باعث ہوا۔

ایک خوشگوار صبح میں کھیلتی ہوئی عرشۂ جہاز پر آگئی اور تھوڑی ہی دیر میں بوڑھی انا کی غفلت کہیے یا شامت کہ سمندر کے تھپیڑوں میں میرا ننھا سا جسم تڑپتا ہوا نظر آیا۔ اللہ! عجب وقت تھا!

مجھے آج تک اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت ایک خوش رو نوجوان نے جس کی عمر تقریباً پینتیس سال ہوگی بڑے جان جوکھوں کا کام کیا تھا یعنی بڑی دلیری سے سمندر کی بے پناہ موجوں میں کود کر مجھے ظالم موت کی بیدردانہ ڈراونی آغوش سے زبردستی نکال لیا۔ میں بیہوش ہوگئی تھی بڑی دیر بعد جب مجھے ہوش آیا تو ایک طرف میں نے

اپنے والد کو دیکھا جو قریب ہی ایک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھے مجھے تک رہے تھے اور دوسری طرف میرا وہی محسن کھڑا مجھے ترحم آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا جس نے میری جان بچائی تھی۔ انا نرونا ش میرے لئے دودھ لئے قریب آگئی اور دودھ کا کٹورا میری طرف بڑھا کر کہا:۔

"جانِ من کچھ پی لو"

میں نے کٹورا اٹھا دیا۔ والد سے سوال کیا۔ "یہ کون صاحب ہیں۔؟"

میرے والد نے مسکرا کر تشکر آمیز لہجہ میں ان سے تعارف کرایا "روحی پیاری! یہ تمھارے محسن لفٹننٹ کرنل جاذب آئی۔ ایم۔ ایس۔ ہیں۔ ان کا شکریہ ادا کرو"

اس زمانہ میں میری حیثیت ایک چھوٹے سے کیڑے کی تھی۔ کیونکہ میں یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اظہار تشکر کے کیا طریق ہوتے ہیں میں نے نرونا ش سے ان صاحب کا شکریہ ادا کرنے کو کہا۔ مگر بوڑھی انّا نے مسکرا کر کہا یہ کام میرا ہے اس وقت میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں اٹھی اور اپنے محسن سے لپٹ گئی اس زمانہ میں میرے خیال میں یہ بہترین اظہار تشکر تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ ہر شخص اپنے محسن کا شکریہ اس سے ایک دفعہ بغلگیر ہو کر ادا کرتا ہے۔

۲

آج اس واقعہ کو گیارہ بارہ سال کا عرصہ گذر گیا ہے مگر میرے ننھے دل میں اپنے محسن کی قدر اب تک اسی جوش و خروش کے ساتھ موجود ہے جیسے پہلے لمحے میں تھی

جس شہر میں ہم لوگ اور میرے والد رہتے تھے اسی شہر میں کرنل جاذب بھی

کئی سال سے رہتے تھے۔ اور رفتہ رفتہ ہمارے خاندانی طبیب بن گئے تھے۔ اور نہ صرف طبیب بلکہ میرے اور میرے والد کے دلی دوست اور رفیق تھے۔

اگرچہ میں کرنل جاذب کو اپنا بزرگ تصور کرتی تھی پر ہماری بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ اکثر اوقات باتوں باتوں میں ہم ہمسنوں کی طرح ایک دوسرے سے لڑ پڑتے تھے پھر جلد ہی ملاپ بھی ہو جاتا تھا، وہ جتنے خوش مزاج، خوش مذاق اور ظریف الطبع ہیں اُتنے ہی مہربان اور رحمدل بھی

مجھے جہاں تک علم تھا ان کی کوئی شادی نہیں ہوئی تھی یا کم از کم میں نے ان کے ساتھ کبھی کسی خاتون رفیق کو نہیں دیکھا تھا۔ آج سے گیارہ بارہ سال قبل جب میں نے انھیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو اُس وقت بھی وہ اکیلے تھے اور اب بھی تنہا ہی رہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے مزید اطمینان کے لئے ان سے پوچھا بھی یہ کہ کرنل آپ کی بیوی نہیں ہیں؟" تو کہنے لگے "نہیں ہیں!"

"کیوں نہیں ہیں"؟ میں نے سوال کیا

بے ساختہ ہنس کر کہنے لگے "کوئی نہیں ملی"

میں یہ سنکر خاموش ہو گئی۔ ان کی تنہائی پر اکثر میں متاسف ہوا کرتی تھی مگر اس کا کیا علاج کہ وہ خود مجرد زندگی کو پسند کرتے تھے۔ سمندر کے کنارے ایک شاندار وسیع نیلے بنگلے میں شریفانہ زندگی بسر کیا کرتے تھے وہ سوسائٹی سے از بس متنفر تھے مگر ہفتہ میں ایک دفعہ شہر کے یورپین ملٹری کلب کو بہ حیثیت ممبر انھیں جانا ہی پڑتا تھا۔

۳

برسات کے دن تھے اکثر گھٹا اٹھتی تھی اور زور کی بارش ہوا کرتی تھی۔

ایک دن شام کے وقت میں کالج سے بھیگ کر گھر آئی۔ سردیوں کے دن تھے راستہ میں مجھے سمندری ہوا لگی گھر پہنچتے پہنچتے طبیعت بگڑ گئی اور خفیف بخار محسوس ہوا۔ میں نے زوناش کو قہوہ لانے کے لئے کہا اور کرنل جاذب کو ٹیلی فون کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ اس شام میرے والد، کلب کے ایک ممبر کے ہمراہ گھوڑ دوڑ میں گئے تھے اس لئے میں تنہا اپنے کمرے میں پڑی گھبرا رہی تھی، بخار سے آنکھیں جل رہی تھیں اور ڈاکٹر جاذب کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔

میں سچ کہتی ہوں ایک محب کے لیے اپنے محبوب کا چہرہ اتنا جاں نواز اسقدر روح پرور نہ ہوتا ہوگا جتنا ایک مریض کے لیے حالت مرض میں اپنے طبیب کا!!

خدا خدا کر کے دروازہ کھلا اور کرنل جاذب مسکراتے ہوئے ہاتھ میں آلۂ سینہ بینی لئے اندر داخل ہوئے انھیں دیکھ کر میری جان میں جان آئی اور بستر پر بیٹھ گئی۔

"میری چھوٹی دوست! تم کو کیا ہو گیا ہے؟" انھوں نے اپنے مخصوص لہجہ میں مجھے مخاطب کیا۔

"بخار" میں نے جواب دیا۔

انھوں نے یہ سنکر اپنی تین سفید انگلیاں میری نبض پر رکھ دیں مسکرا کر کہنے لگے۔ "آج شاید کھٹی کھٹی نارنگیاں کھائی ہیں اسی کا یہ سبب ہے۔"

میں چڑ گئی "میں نے نارنگیاں نہیں کھائیں۔ آپ کو مذاق اچھے وقت سوجھتا ہے کرنل۔ آخر نارنگیوں کا کیوں خیال آیا آپ کو؟ زوناش نے آج دوپہر گلدان میں

نارنگی کی چند کلیاں سنواری تھیں شاید اُسی کی بو آرہی ہے۔"

"کہاں سے؟" کرنل صاحب نے عجیب بیساختگی سے سوال کیا۔ "وہ گلدان کہاں ہے؟"

"کیوں؟" میں نے متحیر ہوکر پوچھا۔

"نارنگی کی کلیاں کہاں ہیں!" انھوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پریشان لہجہ میں پوچھا۔

میں حیران ہوکر بولی "بھلا اس میں پوچھنے کی کونسی بات ہے؟ تیز بو کمرہ میں بھر گئی ہے! کیسی اچھی بو ہے! وہ دیکھئے" ـــــ دریچے کے پاس گلدان میں۔"

کرنل صاحب نے مڑکر دیکھا اور پھر ایک عجیب لہجہ میں بولے "خداوندا! انھیں نکال پھینکو، نکال پھینکو، نکال پھینکو، میں انھیں برداشت نہیں کرسکتا۔"

انھوں نے باغ کی طرف چہرہ پھیر لیا ایک دریچے کے آگے کوچ پر بیٹھ گئے ان کی سفید پیشانی پر دریچے میں سے ہوکر ایک قسم کی اودی روشنی ناچ رہی تھی وہ مصر کی کسی قدیم ممی کی طرح ساکت بیٹھے دریچے کو گھور رہے تھے۔

میں ڈر گئی ـــــ اللہ! سفید ہوگئی! ویسے میں کچھ زیادہ مضبوط دل کی عورت نہیں ہوں وہ تو بھلا ہوا کہ اُسی وقت زوناش قہوہ لئے اندر آگئی ورنہ میں مارے دہشت کے چیخ مار کر کمرے سے بھاگ جاتی!

کرنل نے التجا کے پیرایہ میں دوبارہ کہا "روحی! ان پھولوں کو دریچے سے باہر پھینکدو۔"

"پیارے کرنل کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے انھیں باہر پھینک دو۔"

وہ باش نے میرے کہنے پر گلدان خالی کیا۔ تب کہیں جا کر ہمارے ڈاکٹر صاحب سنبھلے میرا انجار تو ایک طرف رہا۔ اب ڈاکٹر صاحب کی بیماری بڑھ گئی اب تک میری سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی۔

آخر میں نے پوچھا "کیا ہو گیا تھا؟"

کرنل جاوب اب تک ہانپ رہے تھے، ان کی صورت درندوں کی سی ہو رہی تھی۔ میرے اصرار پر کہنے لگے :-

"بچی! مجھ سے اس کے متعلق کچھ نہ پوچھو! میں واقعی ایک جانور بن گیا تھا"

"جانور نہیں" میں کہنے لگی۔ "بلکہ ایک پراسرار دلچسپ روح! بھلا جانوروں کی زندگیوں میں ایسے پراسرار واقعات بھی ہوتے ہیں!"

"تم افسانہ نگاروں کو اور آتا کیا ہے؟" انھوں نے سگار سلگا لیا اور اس کے دھوئیں کو متبسم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے "اپنے دوستوں واقف کاروں ملاقاتیوں کی زندگی کو قصہ بنا کر پبلک کے آگے پیش کرنا تم لوگوں کا محبوب شغل زندگی ہے مگر روحی! اس وقت بچہ مت بنو۔ اس ذکر کو چھوڑ دو (چھوٹی سی آہ بھر کر)

گذاری ہیں خوشی کی چند گھڑیاں انھیں کی یاد میری زندگی ہے

یہ کہتے ہوئے ان کا چہرہ بے حد اداس اور سنجیدہ ہو گیا۔ انھوں نے پھر ایک دفعہ گلدان کو دیکھ کر کہا "خالی کر دیا تم نے؟"

"ہاں" ——— میں نے جواب دیا۔ "کرنل! آپ کیا نارنگیوں کی کلیوں سے

ڈرتے ہیں۔"

"ڈر؟ ہاں ذرا وحشت ہوتی ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے سگار سے راکھ جُدا کی۔

"آخر کیا بات ہے؟ وحشت کیوں ہوتی ہے؟"

وہ تنگ آ کر کہنے لگے "تمھیں اس قدر اصرار کیوں ہے اس میں کسی قسم کا راز یا افسانہ نہیں ہے میری بچی! تم نے اکثر دیکھا ہو گا کہ بعض لوگ جھینگر سے خوف کھاتے ہیں دور کیوں جاؤ. تمھارے پروفیسر صاحب مکڑی سے کانپ جاتے ہیں. بعض سانپ سے ڈرتے ہیں بالکل اسی طرح نارنگی کے پھولوں سے میں خوف کھاتا ہوں۔"

"تعجب! تعجب!!"

میں رات بھر اس پراسرار "الف لیلوی" واقعہ پر غور کرتی رہی پر کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی اور ذرا خیال تو کیجئے کہ بھلا مجھ جیسی عورت، جس کی تمام زندگی افسانہ نویسی اور شعر و شاعری میں گذر رہی ہو کیونکر اس افسانوی واقعہ کو فراموش کر سکتی ہے۔"

بخار کم ہو گیا تھا، اور خیال، سرزمین خواب کی طرف گھومنے چلا گیا تھا رات تاریک تھی، پر سنسان! میں نے الماری میں سے ٹھیکرے کی ایک شگفتہ مضمون والی کتاب نکالی اور رات بھر لیٹی لیٹی پڑھتی رہی۔

۴

کالج میں چھ دن کی تعطیل تھی

صبح کا وقت تھا۔ میں برآمدے میں ایک کرسی پر دھوپ میں بیٹھی تھی اور

سوچ رہی تھی کہ تعطیلات کس شغل میں بسر کروں۔ والد اپنے کسی دوست کے ہمراہ شکار کو گئے ہوئے تھے۔ مگر آپ جانئیے مجھ جیسی خواب و خیال کی شیدائی رحمدل عورت کو شکار جیسے موذی مشغلے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ میں نے انکار کر دیا تھا۔ اور گھر پر تنہا تھی۔

لفٹننٹ کرنل جاذب کوئی دو ہفتوں سے "اودے پہاڑوں" پر گئے ہوئے تھے میری خواہش تھی کہ چھ دن کے لیے ڈاکٹر صاحب کے پاس چلی جاؤں، اتنے میں نوکر نے ایک تار پیش کیا۔ میں نے کھولا تو دیکھا کہ کرنل کا ہے "دل را بدل راہست" سمجھ کر میں خوب مسکرائی وہ مجھے دعوت دے رہے تھے۔

"آج شب یہاں ہملیٹ کھیلا جا رہا ہے۔ تم ضرور آؤ۔ جاذب"

ہملیٹ!۔ وہ عجیب و غریب جادو نگار کھیل! جس نے ایک شاعر کو اس قدر مقبول و محبوب بنا دیا کہ وہ سب کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ ایسے کھیل کو نہ دیکھنا کفران نعمت ہے۔

یہ سوچتے ہوئے میں نے وقت دیکھا دس بجکر پچیس منٹ ہو گئے تھے، اور میرے لیے کافی وقت تھا کیونکہ "اودے پہاڑوں" کی ایکسپرس بارہ بجے نکلنے والی تھی۔

ساڑھے چار گھنٹوں کا سفر تھا

۵

جب میں کرنل جاذب کے گھر پہنچی تو ایک بڑا سا ستارہ مجھے بادلوں میں سے جھانک رہا تھا۔ موسم بہت سرد تھا اور ہوا تیز چل رہی تھی پورے گاؤں میں

دھواں دھواں سا نظر آرہا تھا۔ کرنل جاذب اپنے مختصر سے دارالمطالعہ میں بیٹھے ایک طبی ماہانہ رسالہ دیکھ رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے بولے "مجھے تمہارے آنے کی مطلق امید نہ تھی میرا خیال تھا کہ تم بوڑھے دوست کی دعوت قبول نہ کرو گی! مجھے خبر ہوتی تو میں خود اسٹیشن پر موجود رہتا۔"

مجھے ہنسی آگئی "اور میں کیا اندھی ہوں؟ کہ تمہارے گھر تک نہ پہنچ سکوں؟"

۶

اومالک! میں اس عجیب و غریب رات کو کبھی نہ بھولوں گی، اپنی زندگی بھر نہ بھولوں گی۔ بات اصل یہ ہوئی اس شب مجھے کہانی لکھنے کے لئے بہت سا مضمون مل گیا! ایسے موقع عموماً کہاں نصیب ہوتے ہیں۔

کھیل کے اختتام پر ایک عجیب واقعہ پیش آیا جو افسانے سے بھی زیادہ عجیب معلوم ہوتا ہے میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے! الٰہی تیری پناہ۔

اس شب لوگوں کی غیر معمولی آمد و رفت تھی۔ میں اور کرنل صاحب ہال کے ایک دروازے سے انسانی متنفس کے جھونکوں سے بمشکل بچ کر نکل رہے تھے کہ دفعتاً ایک خاتون جو بظاہر ایک نئی دلہن معلوم ہوتی تھیں، سینے پر نارنگی کی کلیوں کا گچھا سنوارے ہمارے قریب سے گذریں ان خاتون کا گزرنا ہی تھا کہ کرنل کے چہرے کا رنگ برف کی مانند سفید ہو گیا اور ایک عجب اضطراب کی حالت میں اس نے اپنے ہاتھ ادھر ادھر پھینکنے شروع کئے۔

وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئے میں نے چھو کر دیکھا تو یخ کی مانند سرد تھے اور کسی قدر کانپ رہے تھے تھوڑی دیر بعد بے اختیار چیخ اُٹھے۔

"آہ معبود! وہ نارنگی کے پھول —— یہاں بھی موجود ہیں!

مجھے برانڈی سے مذہبی کراہت ہے مگر اس موقع پر میں نے تھوڑی سی کرنل کے لیے مہیا کی تھوڑی دیر بعد ان کی حالت کچھ سنبھلی مگر قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں باہر آ گئے۔ سردی خوب تھی شہر میں دھواں دھواں سا نظر آ رہا تھا سڑکیں شبنم کے پردوں میں غائب ہو گئی تھیں۔ جبر یہ سب مجبوریاں ایک طرف تھیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مجھے اب خود کرنل صاحب سے ڈر لگتا تھا۔ الٰہی! کرنل دراصل کہیں شیطان تو نہیں! بھوت تو نہ ہو گا! کیا عجب کوئی بدروح ہو گی! جو مجھے دھوکہ دے رہی ہے۔

وہ شب مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ گھر پہنچ کر ڈاکٹر نے مجھ سے کہا پیاری بیٹی! تم جنوبی طرف کے کمرے میں سو رہو۔ میں آج مطالعہ میں گذاروں گا۔ طبیعت بے چین ہے اور دماغ بہت تھکا ہوا۔

۷

دوسری صبح گرم اور خوشگوار تھی۔

ناشتے کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب اپنے ایک نفیس صندلی فلالین میں کھڑے تھے اور مسکرا رہے تھے: "آداب روحی! مزاج شریف"

"اور آپ کا مزاج کیسا ہے؟"

"کرنل نے مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ کر کہا "بہت اچھا رات بھر میں پڑھتا رہا مگر پانچ بجے سو گیا تھا۔ ہوا تیز اور سرد چل رہی تھی۔"

"مگر مجھے تو نیند نہیں آئی۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ رات کے واقعات نے میرے خیالات کو پراگندہ کر دیا تھا۔ بھلا میں کیوں کر سو سکتی تھی۔"

کرنل نے ایک دلفریبی کے انداز میں مسکرا کر کہا "میں اپنے راز اپنے دوستوں پر ظاہر کرنے کا عادی نہیں۔ سقراط کہتا ہے کہ جب تمہارا راز تمہارے سینہ میں نہیں سما سکتا تو دوسرے کے سینہ میں کیوں کر سمائے گا؟"

میں ذرا کھسیانی ہو کر بولی "ٹھیک ہے! تم بہت اچھا کرتے ہو کہ اپنا راز کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔ مگر تم نے یونانیوں کے چشم و چراغ دیاس کا وہ قول بھی سنا ہے؟ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ "ہر کس و ناکس کو اپنا رازدار نہ بناؤ" اس سے دیاس کا یہی مطلب تھا کہ سوائے اپنے نہایت محبوب و معتبر دوست کے کسی غیر پر اپنا راز افشا نہ کرو۔ اس کے یہ معنی تو ہو نہیں سکتے کہ اپنا راز اپنی قبر میں لے جاؤ بھلا کرنل دنیا میں دوست پھر کس مرض کی دوا ہیں۔"

اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا "روحی! معلوم ہوتا ہے وہ وقت قریب آگیا ہے کہ میں اپنی زندگی کے عظیم الشان راز کو افشا کر دوں۔ میں نے آج تک اسکو اپنے سینے میں چھپائے رکھا مگر اس وقت مناسب یہی معلوم ہوتا ہے اپنے قصہ حیات کو تمہارے آگے من و عن بیان کر دوں۔

"زہے نصیب" میں نے کہا۔

وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا بولا! مگر یہ جگہ موزوں نہیں ہے چلو ہم دوپہر کے کھانے تک باغیچے میں بیٹھیں گے"

باغ میں سرور آگیں ہوا چل رہی تھی۔ زیتون کے درختوں پر سرخ چونچ والے پرند گیت گا رہے تھے۔

ہم دونوں باغ کی ایک چھوٹی سی دیوار کے قریب ایک بانس کی کوچ پر بیٹھ گئے۔ کرنل نے ایک سگرٹ سلگایا۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

۸

میں یہ نہیں جانتا کہ عورتیں محبت میں صادق القول ہوتی ہیں یا نہیں — ! مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ محبت کے متعلق عورتوں کے کیا خیالات ہوتے ہیں! میں جانتا ہوں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ عورتیں جب کسی سے —— کسی خوش قسمت سے واقعی محبت کرنے لگتی ہیں تو وہ کائنات کو ایک جریدۂ عشق خیال کرنے لگتی ہیں اور اگرچہ وہ نہایت کمزور رہتی ہیں مگر ان کی محبت کی طاقت کا مقابلہ خدا مجھے معاف کرے تو میں یہ کہنے کو تیار ہوں کہ الوہیت کی قوت بھی نہیں کر سکتی۔

ایک زاہد خشک کی زبانی ان عشقیہ الفاظ کو سنکر میں ششدر رہ گئی

کرنل! تم نے کیا اپنی عمر میں کسی عورت سے محبت کی ہے ؟

وہ ایک مغرور مسکراہٹ سے کہنے لگا " ہاں اور نہ صرف میں نے کی ہے بلکہ ایک عورت کی طرف سے چاہا جا چکا ہوں"

یہ سنکر میں نے کرنل پر ایک نقادانہ نگاہ ڈالی واقعی وہ اپنی جوانی میں ضرور

قابل محبت ہوگا۔ اب بھی اس کی حرکات سے ایک دل کشی ٹپکتی تھی شکل وصورت بھی بری نہیں تھی چھوٹی چھوٹی گہری نیلی آنکھیں مختصر سی سنہری مونچھ دراز قد اور سڈول جسم۔

اس نے پھر کہنا شروع کیا:۔ مجھے وہ رات کبھی نہ بھولے گی آج سے پچیس سال قبل کا واقعہ ہے —— میں ستمبر کی ایک دھندلی شام اپنے دارالمطالعہ میں بیٹھا اپنی طبی درسی کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا ماہ کے اختتام پر میرا امتحان تھا میں مکان میں تنہا تھا کیونکہ میرا بھائی نوتاش تجارتی سلسلے میں بصرہ اور بغداد کی طرف گیا ہوا تھا، دفعتاً کسی نے باہر اطلاعی گھنٹی بجائی میں باہر نکل آیا میرا بھائی موٹر سے اُتر رہا تھا اس کے ساتھ ایک نوجوان خاتون سیاہ برقعہ اوڑھے کھڑی تھی ایک خاتون کو ساتھ دیکھ کر میں متحیر ضرور ہوا مگر کسی قسم کا اظہار کئے بغیر نوتاش کے پاس چلا گیا میرے بھائی نے مجھے بغور دیکھا، پھر یہ کہتے ہوئے:۔

"یہ میرا چھوٹا بھائی جاذب ہے"

مجھے اس نوجوان خاتون کے آگے پیش کیا پھر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میرے بھائی نے مجھ سے کہا:۔

"یہ تمھاری بھاوج ہیں"

نوجوان خاتون نے سر جھکا کر میرے سلام کا جواب دیا۔ رسم تعارف کے ادا ہوتے ہی اس خاتون نے نقاب اُلٹ دیا میں نے کبھی اس قدر پیارا چہرہ نہ دیکھا تھا مشرقیوں کا حسن تھا سرخ وسفید چہرہ ایشیائی حسن سے معمور سیاہ آنکھیں، سیاہ چمکیلے لمبے بال، چھوٹا سا قد اور شریف مسلم خواتین کی فطری شرم وحیا بظاہر

کوئی عربی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔

میں نے حیران ہو کر اپنے بھائی کو دیکھا اور میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"بھائی صاحب آپ نے کیا پردیس میں شادی کر لی ہے"؟

میرا بھائی ایک بہت ہی خشک مزاج آدمی تھا اس نے میرے سوال کے جواب میں صرف "ہاں" کہا اور اس خاتون کا ہاتھ پکڑ کر اندر چلا گیا۔

۹

دن گزرتے جاتے تھے میرا بھائی تجارتی سلسلہ میں اکثر سفر پر رہا کرتا تھا اور میرا بہت سا وقت میڈیکل کالج میں گزر جاتا تھا میری نوجوان بھاوج کو مکان میں تنہا رہنا پڑتا تھا۔

ایک شام سات بجے کے قریب میں کالج سے تھکا ماندہ واپس آیا جونہی میں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا میری نظر میز کی طرف پڑی جہاں میری کمسن بھاوج بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی غالباً اسے میرے آنے کا علم نہ تھا اس کو اپنے کمرے میں دیکھ کر مجھے کسی قدر حیرت ہوئی۔

آج عمر میں پہلی مرتبہ میں نے اسے غور سے دیکھا تھا وہ کچھ حد سے زیادہ حسین و جمیل نظر آ رہی تھی۔ پیازی رنگت کا لباس پہن رکھا تھا سیاہ ریشم کے رومال سے سر لپٹا ہوا تھا معلوم ہوتا تھا کہ وہ چہل قدمی سے واپس آئی ہے۔ کانوں میں موتی کے آویزے تھے، آج زندگی میں پہلی دفعہ مجھے ایک عورت کی دلکشی کا احساس ہوا اور اس قدر گہرا اثر میرے قلب پر ہوا کہ میں اس دلفریب منظر کو چھوڑ کر تنہائی پسند نہ کرتا تھا۔ اس وقت میں اسی حالت میں کھڑا رہا عالم بے اختیاری میں میں نے

زور سے اپنا ہاتھ میز پر رکھا، وہ چونک پڑی اور کاغذ اس کے ہاتھوں سے نکل کر دور جا پڑا۔

اُس کو اُٹھا لاؤ"۔ اس نے کسی قدر آہستہ سے کہا اس کی آواز میں کسی قسم کی جھجک یا تحکم مطلق نہ تھی۔

میں مقناطیسی پتلے کی طرح فوراً تعمیل حکم میں مصروف ہو گیا، اور کاغذ لے کر اُس کی طرف گیا"

اتنا کہہ کر کرنل نے چونک کر میری طرف دیکھا "اب روحی! یہ کیا۔ کیا میری زندگی کا افسانہ لکھ رہی ہو؟"

میں مجرموں کی طرح کرنل جاذب کی طرف دیکھنے لگی

قصہ پھر شروع ہو گیا

"مگر اس نے وہ کاغذ نہیں لیا۔ کہنے لگی "جاذب"! یہ تمھارے ہی لیے لکھا گیا ہے اس لئے مجھے واپس نہ کرو" ——— !وہ عربی زبان میں تقریر کر رہی تھی اور میں عربی کچھ کچھ سمجھ سکتا تھا روحی! پہلی مرتبہ اس حسین لڑکی کی زبان سے اپنا نام سنکر مجھے واللہ بڑا پیارا آیا۔ میں نے کاغذ کو دیکھا جس پر میرا نام تین دفعہ نہایت خوبصورت حروف میں لکھا ہوا تھا۔

جاذب، جاذب، جاذب

میں مبہوت رہ گیا میرے جسم سے ایک گرم بھاپ نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اور میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس وقت کی دلی کیفیات کو میں الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا ۔ روحی کمرے کی ہر چیز ارگن معلوم ہوتی تھی جس سے دلچسپ اور محبت آمیز راگ نکل رہے ہوں۔ میں نے اس جان بخش تحریر کو دوبارہ دیکھا میری پیاری روحی! تم

یقین کرو ۔ میں شدت مسرت سے پاگل ہو رہا ہوں میری زندگی میں پہلی دفعہ ایک عورت مجھ سے اظہار محبت کر رہی تھی، تم عشق و محبت کی چاشنی کو کیا جان سکو گی تم اس کوچہ سے ناواقف ہو بھلا کسی نے تم سے کبھی اظہار محبت و شوق کیا بھی ہے ؟ ——

ننھی لڑکی ۔ ۵

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد

ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

ناولوں میں اکثر مجھے عشقیہ گفتگو پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا سینما کے پردوں پر میں نے بہت سی شوق و محبت میں ڈوبی ہوئی حرکتیں دیکھی تھیں، پر مجھے کبھی زبانی سننے کا موقع نہیں ملا تھا میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا اوہ! یہ لڑکی —— یہ کمسن سیاہ چشم لڑکی، ہاں یہ میری بھاوج مجھ سے محبت کرتی ہے —— ! محبت وہی —— عطیہ الٰہی جو آدم و حوا کو نیچر نے عطا کیا تھا! آج وہی مجھ سے ملنے والا تھا! اے خوشا بخت! —— کیا اسے زرتاش سے محبت نہیں ہے! مجھے زرتاش پر ترجیح دے رہی ہے! مجھے! زہے نصیب! زہے نصیب میرے! بے شک! کوئی وجہ نہیں کہ دنیا میں خوبصورتی اور مسرت میرے بھائی کے حصے میں آئے اور میں اس سے محروم کر دیا جاؤں میں وفور شوق میں دیوانہ ہو رہا تھا، اور حسین شیریں کے لیے ایک دریائے محبت میرے سینہ میں موجزن تھا۔

کمرہ تاریک پڑا تھا۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں، چاند کھجور کی سبز اور نازک ٹہنیوں پر مسکرا رہا تھا اور میں کمرے میں تنہا تھا زہرہ باہر چلی گئی تھی —— شیریں میری سجدہ گاہ آرزو میری مرکز زندگی، میری پیاری شیریں باہر چلی گئی تھی، کمرے سے باہر!

اب ایک لمحہ کے لیے بھی مجھ سے اس کی جدائی برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ واللہ کیا دن تھے نئے نئے۔ ولولے نئے نئے خیالات میرے دماغ کو بے چین کر رہے تھے۔

شیریں! راحت جان شیریں، کہتا ہوا میں دروازے تک بھاگا۔ خدا جانے میں شدت وحشت میں کیا کر گزرتا! اچانک مجھے یاد آگیا کہ شیریں میری قابل تعظیم بھاوج ہے۔

میں ایک ستون کا سہارا لئے کھڑا ہو گیا۔ دل سے کہنے لگا "واہیات! محض واہیات! شیریں میری بہن ہے! میری بھاوج ہے! میرے بڑے بھائی کی بیوی! اس لئے اس کی تعظیم و تکریم مجھ پر فرض ہے۔ سنتا ہوں اکثر عورتیں ہسٹریا کا شکار ہو جایا کرتی ہیں اور اس مرض میں مبتلا ہو کر جنونی حرکات کی مرتکب ہوتی ہیں۔

میں واپس اپنے کمرے میں آگیا جیب میں سے وہ جاں بخش تحریر نکالی چراغ کی روشنی میں پڑھنے لگا مسکراہٹ بے اختیار میرے ہونٹوں پر کھیلنے لگی بے چینی بڑھی۔ آہ سچ ہے ؏

"کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا"

بے قراری لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی میں باغ کے دریچے میں جا کھڑا ہوا۔

سامنے چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا میرے دل، میری روح سے ایک آواز آ رہی تھی، ایک نغمہ نکل رہا تھا اور وہ نغمہ یہ تھا کہ اگر واقعی وہ مجھ سے محبت کرتی ہے ـــــ کر رہی ہے ـــــ کرنے سے مجبور ہے تو انکار میرے بس کی بات نہیں!"

اسی سوچ و فکر میں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے میرا شانہ چھوا۔ اور نرم و نازک ارغنوں کی سی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا

"تم اس قدر حیران کیوں ہو۔؟"

میں نے مڑ کر دیکھا تو راحت جان شیریں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ چاندنی کی روشنی میں اس نازنین عورت کا سفید اور دلربا چہرہ اس قدر محبوب اور خوبصورت نظر آ رہا تھا کہ اگر اس وقت دنیا کی ساری عورتیں بھی مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتیں تو میں متوجہ نہ ہوتا۔ خدایا! کیا واقعی یہ زہد فریب عورت مجھ سے محبت کرتی ہے اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کا بھولا پن اور فرشتوں کی سادگی برس رہی تھی۔

میری پیاری شیریں:——"

بے ساختہ زبان سے نکلا۔ وہ بغور میرے چہرے اور میری حرکات کو دیکھ رہی تھی اور میں —— کبھی بے تاب، کبھی بے قرار ہو کر اس پر گرنا چاہتا تھا۔ اور پھر سنبھل جاتا تھا۔

یکایک کسی خیال نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے شیریں کی طرف دیکھا! ——

وہ میرے بھائی کا خیال تھا، بیساختہ میری زباں سے نکلا "میری بھاوج!"

"بھاوج! ——" اس نے حقارت کے لہجہ میں کہا "بھاوج! تمہاری بھاوج! بھلا ایک غیر شادی شدہ عورت کسی کی بھاوج کیوں کر ہو سکتی ہے مرد واقعی بڑے کم فہم ہوتے ہیں!"

تو یوں کہئے! یہ ہمارے بھائی صاحب کی کارستانی تھی! یہ ان کی بیوی نہیں! تو یوں کہتے یہ ہماری بھاوج نہیں —— یہ سوچکر میں نے مڑ کر شیریں سے ایک سوال کیا۔

بر آہ — وہ کمرے سے باہر جا چکی تھی میری شیریں مجھے میرے تمام ہمجنسوں کو کم فہم بنا کر باہر جا چکی تھی۔

میں دیوانہ وار یہ گاتا ہوا شیریں کے پاس چلا۔ ؎

تم سے کچھ کہنے کی خواہش ہے مری خاطر نشیں
آہ لیکن کیا مجھے خود بھی خبر اس کی نہیں
اور اگر تم اتفاقاً پوچھ لو مجھ سے کہیں
تو فقط اتنا کہوں گا "تم سے الفت ہے مجھے"
اضطراب شوق میں ایک خط تمھیں لکھوں اگر
اور اس میں رکھ بھی دوں اپنا دل مجروح اگر
تم پہ ظاہر کر بھی دوں جذبات گوناگوں اگر
تو یہ مطلب ہوگا "بیحد ہی محبت ہے مجھے"
میں کبھی آمادہ ہوتا ہوں جو گانے کے لئے
یعنی اپنا راز دل تم کو سنانے کے لئے
تو یہی دو لفظ ہیں میرے ترانے کے لئے
"تم سے راحت ہے مجھے، تم سے مسرت ہے مجھے"

دلاگاسیفیلی کی اس نظم کو میں عالم بے خودی میں چیخ چیخ کر گا رہا تھا۔ دنیا کی ہر چیز مجھے عشق و محبت کے ترانے سنا رہی تھی۔

اللہ! کیا دن تھے! کیا راتیں تھیں!

یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس کے بعد میرے اور میرے بھائی کے آپس میں کیسے تعلقات رہے۔

ہم آپس میں ایک دوسرے سے بہت کم بولنے لگے اکثر ضرورت پر یا جب کھانے پر اکٹھے ہوتے تو مجبوراً دو ایک لفظ ہماری زبان سے نکلتے ورنہ ہر وقت مکان پر ایک سکوت مطلق چھایا ہوا رہتا۔ سوائے اس کے کہ شیریں اکثر شام کے وقت پیانو پر عربی شعراء کی غزلیں بجا کر گایا کرتی جس کو میرا بھائی اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھا سنا کرتا اور میں اپنی جگہ اس سے لطف اندوز ہوتا میرے بھائی کو موسیقی کا بہت شوق تھا۔

ایک دن شام کے وقت میرا بھائی بالاخانہ سے نیچے اتر رہا تھا اور میں اوپر جا رہا تھا۔ دفعتاً دونوں کی نگاہیں ملیں۔ وہ زینہ پر کھڑا ہو گیا یہ دیکھ کر کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے میں بھی کھڑا ہو گیا۔

"جاذب! کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ تم کہیں اپنی رہائش کا علیحدہ انتظام کر لو ماشاء اللہ اب تم جوان ہو۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میں تمہاری تعلیم و تربیت کے فرض سے سبکدوش ہو چکا ہوں"

میں نے مستعد لہجہ میں جواب دیا "میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو میں انشاء اللہ کل ہی اس کا انتظام کر لوں گا"

"بہتر ہے" یہ کہہ کر میرا بھائی نیچے چلا گیا۔

میں اپنے مستقبل کے متعلق کچھ سوچتا ہوا اوپر چلا آیا۔ بالاخانے کے برآمدے

کی دیوار پر کہنیاں ٹکا کر نیچے باغیچہ کے شگفتہ پھولوں کو دیکھنے لگا، وہ بڑی خوشگوار شام تھی۔ دسمبر کے مہینے کے پھول کھِلے ہوئے تھے۔ ہوائیں ارغنوں کا سا شور تھا شہر پر نمار آسمان پر گیت گا رہے تھے اور باغ پر سورج خوب چمک رہا تھا۔

شیریں کی مفارقت میرے لیے موت سے بدتر تھی۔ آہ! میں کیونکر اس کو چھوڑ جاؤں! اللہ یہ محبت بھی کیسی عجیب چیز ہے کتنی پاکیزہ! مگر کس قدر جان لیوا اور تکلیف دہ!

ابھی میں فلسفہ محبت پر غور کر ہی رہا تھا کہ کسی کی گرفت نے مجھے چونکا دیا وہ ہاتھ میری گردن میں حمائل تھے۔ مڑ کر دیکھا تو شیریں۔

وہ ایک سفید رومال سے آنکھ پونچھ رہی تھی میں نے انتہائی محبت کے لہجہ میں اس سے پوچھا

"تم کیا کر رہی ہو؟"

اس نے دھیمی آواز میں بتایا "رو رہی ہوں"

"روتی کیوں ہے؟ میں نے اس طرح جیسے کوئی اپنی پالتو بلی سے مخاطب ہوتا ہے اس سے باتیں شروع کیں "کیا ہو گیا میری شیریں کو؟"

وہ کہنے لگی "جاذب! میں یہاں نہیں رہ سکتی! میں تمھارے بھائی کے ساتھ نہیں رہ سکتی

"کیوں نہیں رہ سکتی"۔ میں نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا پھر کہنے لگا "شیریں! تمھیں معلوم ہے کہ میں کل تم سے جدا ہو جاؤں گا"

"نہیں مجھے اس کی خبر نہیں! کیونکر جدا ہو گے؟"

میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا:۔ علیحدگی! میں ہوٹل میں جا رہا ہونگا زرتاش کی یہی خواہش ہے۔

"تو اس میں جدائی کا کیا ذکر ہے میں تمہارے ساتھ چلوں گی! جاذب! تمہارے بھائی ایک نہایت سفاک آدمی ہیں، تم جانتے ہو گے گذشتہ شب انھوں نے مجھ سے کیسی سخت کلامی کی تھی۔ ایک سخت کلام بے پروا مرد ایک عورت کے ساتھ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا"

مگر میں تو کسی اور مسئلہ پر غور کر رہا تھا تھوڑی دیر بعد چیخ اٹھا "میرے ساتھ" میرا سانس پھول گیا "تم میرے ساتھ چلو گی؟ شیریں! تم میرے ہمراہ آنے پر رضامند ہو ——؟ مگر —— زرتاش ——!"

"واہیات مت بکو" اس نے بے زار ہو کر کہا "جاذب! تم واقعی ایک بہت ہی پیارے احمق ہو۔ کیا تم اتنا نہیں سمجھ سکتے کہ میں اس کی بیوی بننا نامنظور کر چکی ہوں!"

۱۱

روحی پیاری! —— یہ بیان کرنا میرے لئے آسان نہیں ہے کہ دوسرے دن میں کن مصائب کا شکار ہوا۔

میں نے اپنا اسباب گرین ہوٹل کی چوتھی منزل پر بھجوا دیا تھا اس سے فارغ ہو کر میں نیچے زرتاش اور شیریں سے الوداعی مصافحہ کرنے آیا۔

شیریں نے بے اختیار میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میرے بھائی کی آنکھیں سرخ ہوگئیں، وہ تو خیریت گذری کہ پستول۔ یا ریوالور جیسی کوئی چیز کمرے میں موجود نہ تھی ورنہ خدا جانے کیا حشر ہوتا۔

زرتاش غصہ کے مارے کانپ رہا تھا اس وقت وہ ایک ڈراؤنا اژدہا معلوم ہوتا تھا۔ جو کوئی دم میں مجھے نگل جائے گا، جب وہ بولا تو اس کی آواز شدت غصہ سے کانپ رہی تھی۔

"جاوید! بڑی شرم کی بات ہے کہ تم اس شخص سے بیوفائی کر رہے ہو اور دھوکا دے رہے ہو جس نے تمہارے پیچھے اپنی عمر برباد کی! جس نے تم کو تعلیم و تربیت دلوائی۔ حیوان سے انسان بنایا۔ ان تمام باتوں کا معاوضہ آج تم اس طرح ادا کر رہے ہو کہ میری زندگی کی مسرت اور میری امیدوں کی روشنی کو مجھ سے ہمیشہ کیلئے چھیننا چاہتے ہو۔ خدا تم سے سمجھے! خدا تم سے اس کا بدلہ لے۔! ذرا خیال تو کرو ——— یہ لڑکی جس سے تم محبت کرنے کے آرزومند ہو جسے تم ورغلا رہے ہو وہ کون ہے ——— وہ تمہارے بھائی کی ہونے والی بیوی ہے! تمہاری قابل تعظیم بھاوج ......"

بھائی صاحب خدا عظیم ہے! ——— میں نے کبھی .... میں اسی قدر کہنے پایا تھا کہ شیریں اٹھ کھڑی ہوئی کہنے لگی:

غلط ہے! محض غلط! میں کسی کی ہونے والی بیوی نہیں ہوں۔ جاوید! خدا کے لیے مجھے یہاں سے لے چلو ——— زرتاش! تم نے جس طرح مجھے دھوکا دیا ہے۔ اسی طرح آج فطرت تم کو دھوکا دے رہی ہے! اوہ! تمہاری آنکھیں کس قدر ڈراؤنی ہیں۔

واقعی میرے بھائی کی آنکھیں لہو کی مانند سرخ ہو گئی تھیں اور چہرے پر درندوں کی سی وحشت برس رہی تھی، اس وقت وہ سخت طیش میں تھا۔ اس نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں

"اے پیارے خدا!" میرا بھائی بلند آواز سے کہنے لگا: "تو ان پر اپنا قہر نازل کر ۔۔۔۔۔ تو نے نوح کی اُمت کو تباہ کر دیا۔ لوط کی قوم کو برباد کیا۔ اسی طرح انھیں فنا کے گھاٹ اُتار"

یہ بد دعا میں سن نہ سکا:۔۔۔ بھائی صاحب۔ بھائی صاحب ۔۔۔۔۔ خدا کے لئے اپنے چھوٹے بھائی"

میں اسی قدر کہنے پایا تھا کہ اُس نے مجھے دھکیل دیا اور یہ کہتا ہوا کہ۔ ع

"تو بھی اچھا نہ رہے دل کے جلانے والے"

باہر نکل گیا۔

دروازہ کھلا اور پھر بند ہو گیا۔

۱۴

اس کے آخری الفاظ اب بھی جب کبھی یاد آتے ہیں تو گھنٹوں قلب پر ایک عجب وحشت سی طاری رہتی ہے!

میرے بھائی کو گئے کامل تین ماہ کا عرصہ گذر چکا تھا شیریں اپنے درپے حادثات سے کسی قدر بیمار ہو گئی تھی اس لئے اسے میں جنوبی ساحل پر بغرض تفریح لے آیا تھا۔

ایک دن میں نے شیریں سے عقد کا تذکرہ کیا جس کو سنکر وہ کہنے لگی

۱۳

۲۔ جنوری کی رات وہ رات تھی جس کی صبح ہمارا عقد ہونے والا تھا۔ اللہ غنی!

وہ بھی کیسی رات تھی۔

چاندنی خوب نکھری ہوئی تھی زرد چاند کوہساروں پر سے جھانک رہا تھا پہاڑی درخت ہوا کے سرد جھونکوں سے ہل رہے تھے میں برآمدے کے زینے پر کھڑا رات کی کسی چڑیا کا دلگداز نغمہ سن رہا تھا جو پاس ہی ایک شمشاد کے درخت پر بیٹھی تھی۔

دفعتاً ہوائیں معطر ہو گئیں خوشبو کی لپٹیں آنے لگیں، نارنگی کے پھولوں کی تیز بو نے جو عموماً عروسی خوشبو کہلاتی ہے میرے دماغ کو معطر کر دیا۔ میں جدھر جاتا تھا۔ مکان کے جس حصہ میں جاتا تھا۔ یہ جان بخش عروسی خوشبو میرا تعاقب کر رہی تھی۔

میں بے تابانہ اپنی دلہن کے کمرے کی طرف چلا۔ اور بغیر کسی قسم کی اطلاع یا اجازت کے دیوانہ وار اندر چلا گیا میری شیریں نارنگی کے پھولوں میں لپٹی ہوئی دریچے کے آگے آرام کرسی پر بیٹھی چاندنی کی سیر کر رہی تھی، سفید ریشمی لباس اور نارنگی کی نوشگفتہ کلیوں سے آراستہ دلہن، اس وقت چاند کی صاف و شفاف روشنی میں یونانیوں کے حسن و عشق کی دیوی معلوم ہوتی تھی میں شدت شوق میں پاگل ہو رہا تھا

"شیریں! دیکھو تو کیسی اچھی رات ہے! ایسی ہی راتیں ہمیں زندگی

سے محبت کرنا سکھاتی ہیں۔ نارنگی کے پھولوں کی یہ خوشبو مجھے مارت النعم تمہارے زمانۂ عروسی کو یاد دلایا کرے گی! شیریں! میری پیاری شیریں! خدا کا شکریہ ادا کرو۔ اس نے ہمیں کیسی کیسی نعمتیں عطا کی ہیں ؟

مگر اس کی بے وقت کی خاموشی نے میرے خرمن آرزو پر بجلی گرا دی میں نے جھک کر اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

پر —— میں نے ایک چیخ کے ساتھ اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میرے منہ سے بے اختیار چیخیں نکل رہی تھیں۔ ہاتھ یخ کے مانند سرد تھا۔

میں نے جھک کر اس کا چہرہ چھوا۔

پر آہ روحی! وہاں کیا تھا —— ہائے وہاں رکھا ہی کیا تھا —— دلہن نوجوان کہیں —— ہمیشہ کے لئے اس کثیف دنیا سے رخصت ہو گئی تھی!

کیا کہوں قاتل تڑپتا چھوڑ کر کیوں چل دیا ؟

وار بھی پورا نہ تھا اور تیغ بھی پوری نہ تھی ؟

ہر طرف موت کا سا سکوت تھا —— بس صرف نارنگی کی کلیوں کی بو کمرے میں مہک رہی تھی۔

ہائے روحی! اب تم کو معلوم ہوا کہ بددعا کیسی ہوتی ہے! ممکن ہو سکے تو تم ہر ایک کی دعا لینے کی کوشش کیا کرو۔ اور جلے دل کی بددعا سے ڈرو۔

۱۴

میں نے ایک چھوٹی سی آہ۔ کرنل کو دیکھ کر کہنے لگی "آہ کسقدر دردانگیز ہے تمہاری داستان! تقدیر نے عجب گل کھلائے!"

"ہاں —— یہ سب نوشتہ تقدیر تھا! اچھا تو میری بیٹی! اب بقیہ کہانی بھی سن لو"

اس نے دوسرا سگریٹ روشن کیا اور کہنے لگا۔

۱۵

جب مجھے معلوم ہوا کہ میری شیریں مجھے اس مصائب و آلام کی دنیا میں تنہا چھوڑ گئی تو میں غش کھا کر نیچے گر پڑا۔

مجھے اس کی خبر نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ مختصر یہ کہ ؎

جہاں جہاں بھی کوئی زندگی کی ٹھوکر تھی !
لئے پھری مری قسمت وہیں وہیں مجھ کو !

سنتا ہوں کہ پاگل ہو گیا تھا، میرے دوستوں نے میرا طبی معائنہ کرا کر مجھے شہر کے پاگل خانے میں بھیجدیا —— اس سے زیادہ وہ کر ہی کیا سکتے تھے! کہانی کا یہ حصہ یقیناً بہت دلچسپ ہے! غور سے سنو!

مجھے ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہو سکا کہ میں کتنے سال پاگل خانہ میں رہا اور کتنی مدت محبوس رہا۔! سنتا ہوں چھ سال!

ایک شب کا واقعہ بیحد دلچسپ اور حیرت انگیز ہے! میں پاگل خانہ کے ایک کمرے میں بستر پر پڑا تھا چاندنی ہر طرف چھٹکی ہوئی تھی، رات گرم اور نہایت

سنسان تھی۔ الو درختوں پر چیخ رہا تھا اور میرے جنونی خیالات سمندر کی موجوں کی طرح ادھر اُدھر ٹکرا رہے تھے۔

شب کے گیارہ بجے ہوں گے —— مجھے کچھ ٹھیک یاد نہیں —— بہرحال رات کچھ زیادہ ہو گئی تھی —— کہ کمرے کے شمالی طرف کا دروازہ کھلا اور ایک نرس (جو میری نگہداشت پر مقرر کی) سفید لباس میں اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں یقیناً دوا تھی اور مجھے پلانا چاہتی تھی۔ وہ مجھ پر جھکی۔

اس کا جھکنا تھا کہ میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور میں پلنگ سے کود کر نیچے جا گرا۔ وفعتاً میرے خیالات نے اپنا رخ بدل دیا کہیں سے کہیں جا پہنچے —— اب میں دیوانہ نہ تھا! مجھے ہوش آ گیا تھا! اب میں دوسروں کی طرح ہر بات کو سمجھ سکتا تھا! روحی! تم نے دیکھا خدا کے ارادے"

"آخر کیا ہوا؟" میں نے سوال کیا۔

"ہوا یہ کہ نرس جونہی مجھ پر جھکی، اس کے سینہ پر سنوارے ہوئے نارنگی کے پھول میرے چہرے پر پڑے! میں نے ان پھولوں میں شیریں کی روح ملفوف دیکھی میں نے انھیں اٹھا لیا سینے سے لگا لیا اور چلا چلا کر کہنے لگا:-

جسم فانی ہے! وہ فنا ہو جاتا ہے! پر روح فنا نہیں ہوتی! نفسی خواہشات فانی ہیں، وہ فنا ہو جاتے ہیں! پر عشق فنا نہیں ہوتا! عشق ایک الٰہی آفت ہے! اسی لئے میری روح کو بھی اس سے عشق ہے میں چیخ چیخ کر کہتا اور پھولوں کو چومتا جاتا تھا۔ میرا جنون دھیرے

دھیرے کم ہوتا جاتا تھا۔ نرس میری ان حرکات کو انتہائی دیوانگی پر محمول کر رہی تھی مگر اس کمبخت کو کیا خبر تھی کہ اب اس سے کہیں زیادہ ہوشمند اور چالاک ہو چکا تھا۔

آہ وہ بھی عجب ستم انگیز گھڑی تھی! میں نے نرس کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ میں پاگل نہیں ہوں مگر اس خدا کی بندی نے ایک نہ سنی! جی چاہتا تھا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کھڑکی کے باہر پھینک دوں جو ہر روز رات کے وقت میرے سرہانے ہوا کے لئے کھلی رہتی تھی اور جہاں اکثر چیخیں مارا کرتا تھا چاند کی شعاعیں رقص کرتی تھیں اور میں اپنی قسمت پر رویا کرتا تھا! ہاں اس کھڑکی کے باہر ——— !

نارنگی کے پھولوں کی تیز بو کمرے میں پھیل گئی تھی، میں تھوڑی دیر کے بعد بے تحاشہ چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ مجھے چیخیں مارنے میں کسی قسم کی شرم نہیں آتی تھی۔ کیونکہ دنیا مجھے پاگل سمجھتی تھی۔ اور وہ رات میری آزادی کی آخری رات تھی میں نے سوچا اپنی آزادی سے کیوں نہ فائدہ اٹھاؤں! یہ سوچ کر میں گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا۔ اور اپنی دلہن کا نام لے لے کر چیخیں مارنے لگا! شیریں! شیریں!

دوسری صبح ڈاکٹر آیا اور اس نے مجھے رہا کر دیا مجھے اپنے کمرے میں لے گیا اور دوستانہ بات چیت کی۔ میں نے اپنی کہانی من وعن اس سے بیان کر دی اس نے مجھے سیر و سیاحت کی رائے دی۔ اسی کے مشورے سے میں جنوبی افریقہ کے سفر پر روانہ ہو گیا، تم کو یاد ہوگا جب تم جہاز سے سمندر میں گر پڑی تھیں

تو سب سے پہلا شخص میں ہی تھا جو سمندر میں کود کر تمہاری مدد کو پہنچا تھا۔ بات اصل یہ تھی کہ میں اپنی جان فنا کرنے پر آمادہ تھا مگر جس کو خدا رکھے اسے کون چکھے۔ میں نے تمہیں بحفاظت پانی سے نکال لیا، اور جہاز پر آ گیا۔ نہ مچھلیوں نے مجھے اس مصائب و آلام سے بھری دنیا سے چھڑایا، نہ سمندر کی خوفناک موجوں نے۔

بس یہ ہے میری داستان !

اب تو تم کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں کیوں "نارنگی کی کلیوں" کو دیکھ کر اس قدر خوفزدہ ہو جایا کرتا ہوں"۔ ؎

اجل نے چاک کیا جب سے اس کا دامن زیست
نہیں تمیز گریبان و آستیں مجھکو!

رسیلا

مسٹر عبدالقادر

مسز عبد القادر

میرا آبائی وطن جہلم ہے۔ میں ۱۸۹۸ء میں وہیں پیدا ہوئی۔ میرے والد بزرگوار مولوی فقیر محمد صاحب مرحوم مالک سراج الاخبار جہلم مشہور و معروف دینی عالم تھے۔ آپ کا فتویٰ چلتا تھا اور بہت سی دینی کتب کے مصنف بھی تھے۔ میری والدہ ماجدہ بہت عابدہ، زاہدہ اور تہجد گزار خاتون تھیں۔ میرے والدین اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ آخری عمر میں انھیں دو اولادیں ملیں یعنی ایک میں اور دوسری میری چھوٹی ہمشیرہ جو کہ خانصاحب مولوی عزیز الدین صاحب مالک فیروز پرنٹنگ پریس کے خلف اکبر عبد المجید خاں کی بیوی ہیں۔ چار سال کی عمر میں میری بسم اللہ شروع ہوئی۔ اور میری تعلیم کا آغاز ہوا۔ مولوی کریم اللہ صاحب قرآن کریم کی تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے۔ اور استانی رحیم بی بی صاحبہ اردو فارسی پڑھانے کے لئے اور استانی حاکم جان صاحبہ سوزن کاری وغیرہ سکھانے کے لئے۔ دوپہر کے وقت مجھے صرف دو گھنٹہ کی چھٹی ملتی۔ سہ پہر کو پیر نیاز عالم صاحب پلیڈر گجراتی جو کہ میرے والد صاحب کے ولی دوست تھے تشریف لاتے، یہ بھی مجھے اردو اور فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ بچپن میں میری عادات عام بچوں سے جداگانہ تھیں۔ مجھے کھیل کود کا شوق

نہ تھا۔ اور نہ ہی کوئی میری ہجولی تھی۔ میں تنہا بیٹھ کر اپنے دل سے باتیں کیا کرتی، کہ میں کون ہوں۔ کہاں سے آئی ہوں اور یہاں آنے سے پیشتر کہاں تھی۔ اور پہروں اسی سوچ میں ڈوبی رہتی۔ اور یہ خیالات میرے دل کو بیچارہ پریشان کرتے۔ اسی پریشانی کے باعث میں راتوں کو عجیب و غریب خواہیں دیکھا کرتی۔ اس کے علاوہ دو خاص جذبے میری فطرت میں موجود تھے یعنی ایک سیاحت کا اور دوسرا علماء و صلحا کی صحبت میں بیٹھ کر معلومات حاصل کرنے کا۔ اور میرا یہ ذوق اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ میری روح ہر وقت بیقرار رہتی تھی۔ دس سال کی عمر میں میرے والدین نے مجھے روحانی تعلیم کے لئے حافظ عبداللہ صاحب کے ہاتھ پر (جو کہ ولی کامل تھے) بیعت کرایا۔ اور میں سلسلہ نقشبندی قادری میں شامل ہو کر حافظ صاحب سے روحانی فیض حاصل کرنے لگی۔ لیکن بدقسمتی سے حافظ صاحب کا انتقال جلد ہی ہو گیا۔ اور میری روحانی تعلیم ادھوری رہ گئی لیکن میری دوسری تعلیم برابر سرگرمی سے جاری رہی چودھویں سال میں میری شادی ایک سرکاری عہدیدار ایم عبدالقادر صاحب سے ہوئی۔ اس کم عمری کی شادی نے تعلیم کے علاوہ میرے دوسرے جذبات کو بھی کچل کر رکھدیا۔ پندرھویں سال میں میرا پلوٹھی کا لڑکا سراج الدین ظفر پیدا ہوا اس کے پانچ سال بعد اس کا چھوٹا بھائی محی الدین عالمگیر اور پھر دو دو سال کے وقفہ پر نصیر الدین ہمایوں۔ عصمت آرا و عفت آرا پیدا ہوئے۔ اور ابھی یہ بچے بالکل معصوم تھے کہ میرے شوہر پر فالج کا حملہ ہوا۔

انھیں علاج کے واسطے لاہور لایا گیا۔ مگر وہ یہیں فوت ہو گئے شوہر کی وفات کے بعد میرا جہلم میں رہنا مشکل تھا۔ کیوں کہ وہاں اب کوئی میرا ایسا قریبی رشتہ دار باقی نہ تھا۔ جو کسی وقت میری یا میرے بچوں کی دیکھ بھال کر سکے۔ اس لئے میں مجبوراً اپنی جائداد کا انتظام ملازموں کے سپرد کر کے لاہور آ گئی۔ جہاں میرے پانچوں بچوں نے پرورش پا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اور علمی قابلیت میں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر نکلے۔ لیکن قدرت نے جو خصوصیت ظفر اور عالمگیر کو بخشی وہ اُن کے دوسرے بہن بھائیوں کے حصے میں نہ آ سکی۔ یعنی ظفر پیدائشی شاعر اور عالمگیر پیدائشی مصور تھا۔ یہ چیز بالکل خداداد تھی جو انھیں بغیر کسی اُستاد کے حاصل تھی۔ اور اس وقت یہ دونوں بھائی اپنے اپنے فن میں یکتا ہیں۔ جب تک میرے بچے زیر تعلیم رہے۔ میں نے اپنے جذبۂ سیاحت کو دبائے رکھا۔ لیکن عالموں کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملتا رہا۔ کیونکہ ظفر کی باوجود کم سن ہونے کے بھی اچھے اچھے علماء و فضلا سے دوستی تھی اور اس طرح میں ہر مذہب وملت کے علماء کی حکیمانہ گفتگو سے تبادلۂ خیالات کرتی رہی۔ ظفر چونکہ بہ نسبت دوسرے بچوں کے زیادہ میرے رنگ میں رنگا ہوا تھا اس لئے وہ بھی سیاحت کا دلدادہ تھا۔ چنانچہ وہ بڑا ہو کر سیاحی زندگی میں میرا معاون ثابت ہوا اُس نے مجھے بے شمار پرانے مناروں اور ویران کھنڈروں کے علاوہ بہت سے دشوار گذار مقامات کی سیر کرائی۔ اور اسی سیاحت کا نتیجہ افسانہ نویسی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ میں افسانہ لکھنے لگی۔ لیکن انھیں شائع کرانے کی جرأت

نہ ہوتی۔ کیونکہ مجھے خوف تھا کہ مبادا میرے افسانوں پر مسلمان لوگ نکتہ چینی نہ کریں۔ دوسرے مجھے اپنی والدہ ماجدہ کے اُن مذہبی عقائد کا بھی خاص احترام تھا جو کہ دیوانگی کی حد تک پہونچے ہوئے تھے۔ اسی لئے میں جو افسانہ لکھتی اُسے ضائع کر دیا کرتی۔ لیکن میرے چند افسانے جو جانے کسطرح ظفر کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ اُس نے بغیر مجھ سے پوچھے مختلف رسالوں میں شائع کرادیئے میرے افسانے بہت مقبول ہوئے۔ لوگوں نے مجھے مبارکباد کے خط لکھے شائقین کی اس حوصلہ افزائی سے میرا دل بڑھ گیا۔ اور اسی سال والدۂ ماجدہ کا انتقال بھی ہو گیا ——— سو میں نے ظفر کے زور دینے پر اپنی پہلی کتاب "لاشوں کا شہر" شائع کرا دی۔ اور اُس کے کچھ عرصہ بعد دوسری کتاب "صدائے جرس" بھی شائع ہوئی۔ لیکن تیسری کتاب راہبہ ابھی زیر تکمیل ہی تھی کہ دنیا کی تباہ کن جنگ چھڑ گئی۔ اور میرے تینوں بیٹے مع اپنی چھوٹی بہن کے لفٹیننٹ بھرتی ہو کر فوج میں چلے گئے۔ اور انھیں ایام میں بڑی لڑکی کی بھی شادی ہو گئی۔ اب میں بالکل تنہا رہ گئی۔ ان سب بچوں کی یکدم جدائی سے میرا تمام وقت اُداسی اور غمگینی میں گذرنے لگا۔ جس سے میری افسانہ نویسی تقریباً مردہ ہو گئی۔ چونکہ میرے چاروں بچے میدان جنگ میں تھے۔ اس لئے اتنے سال تک میرا قلم صرف اپنے بچوں سے خط و کتابت کے واسطے مخصوص رہا۔ لیکن اب جس دن سے خداتعالےٰ نے جنگ ختم کر کے میرے تفکرات کا خاتمہ کیا ہے۔ تب سے میری افسانہ نویسی پھر زندہ ہو رہی ہے چنانچہ (راہبہ) پایۂ تکمیل کو پہونچ گئی ہے

جسے انشاء اللہ کشمیر سے واپس جاتے ہی شائع کرادوں گی۔ اور اب چوتھی کتاب کی تیاری میں مصروف ہوں۔ جو کہ "راہبہ" کی طرح لمبا انتظار نہ کرائیگی۔

میں من کوٹ میں ایک برانچ سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ یہ سکول شہر سے باہر کھلی فضا میں ایک نہر کے قریب واقع تھا جس سے تھوڑے فاصلہ پر بسنت رام کی کٹیا تھی۔ یہ ایک چرسی سادھو تھا جس کے پاس قصبہ کے تمام چرسی جمع ہوا کرتے تھے بسنت رام زندہ دل ملنسار اور خوددار آدمی تھا۔ اس نے نور کا گلا پایا تھا۔ اس کی آواز میں اتنا رس تھا کہ جانوروں تک کو اپنے داؤدی نغموں سے مسحور کر لیتا تھا۔ یہی چیز میری اور اس کی دوستی کا باعث تھی۔

جاڑا ہو یا طوفان رات کے پچھلے پہر راگنی آسا گانا گویا اس کے فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ پو پھٹنے پر جب وہ اپنی غمگین لے اور پرسوز آواز سے ملتانی زبان میں (وت نہیں آوناوے پیارے کھیڑاں وے دل چار نی ماے) گانا شروع کرتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ سرسوتی دیوی اپنی پوری شان ربوبیت کے ساتھ

کسی جدید راگنی کی تخلیق میں مصروف ہے۔ یا کوئی فرشتہ آسمان کی انتہائی بلندیوں سے ملکوتی نغمے عالم ناسوت میں بکھیر رہا ہے۔ اس کے گیت میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتے تھے۔ میں اس کے گیتوں کا عاشق تھا اور خصوصاً راگنی آسا کا کیونکہ یہ راگنی میری روح کی غذا بن چکی تھی۔ اس لیے میں من کوٹ سے باہر نہ جانا چاہتا تھا۔ جب کبھی تبدیلی کی بھنک میرے کان میں پڑتی تو میں انسپکٹر کی منت وسماجت کر کے پھر یہیں رہ جایا کرتا۔

۲

من کوٹ کہنے کو تو قصبہ تھا مگر اپنی دیرینہ شان وشوکت کے لحاظ سے اچھا خاصا شہر تھا۔ بڑے بڑے بازار۔ سکول۔ ہسپتال وغیرہ سب کچھ موجود تھے اگر کچھ کمی تھی تو ریل گاڑی کی۔ کیونکہ ریل گاڑی صرف غازی گھاٹ تک ہی آتی تھی۔ اور باقی چالیس میل کا سفر لاری یا کسی دوسری سواری کے ذریعہ طے کرنا پڑتا تھا

یہی وجہ تھی کہ من کوٹ دوسرے شہروں کی طرح ترقی نہ کر سکا۔ اور اب تک قصبہ ہی کہلاتا رہا۔ یہاں آبادی زیادہ تر ہندوؤں کی تھی۔ جو چودھری کہلاتے تھے۔ ان کی حویلیاں بہت بڑی اور پرانے وقتوں کی بنی ہوئی قلعہ نما تھیں۔

من کوٹ گو ایک صحرائی علاقے میں واقع تھا۔ مگر شاہجہاں کے عہد کی قدیم نہر کے کنارے آباد ہونے کے وجہ سے یہ مقام بہت سرسبز وشاداب تھا اس علاقے میں آم اور کھجور کے درخت کثرت سے تھے۔

نہر کے پاس کوس بھر کے فاصلے پر ٹکر نامی ایک گاؤں آباد تھا جس کے اردگرد من کوٹ کے چودھریوں کی جاگیریں تھیں۔ اور موضع ٹکر میں پختہ حویلی صرف ایک ہی تھی جس کا مالک چودھری گوبند رام تھا۔

گوبند رام نہایت بوڑھا آدمی تھا، تمام چودھری برادری کا سردار تھا راج دربار میں بھی اس کی عزت تھی۔ اس کی حویلی کے سیاہ زنگ آلود اٹے گذشتہ عظمت اور مٹی ہوئی تہذیب کے گن گاتے ہوئے من کوٹ سے صاف دکھائی دیا کرتے تھے۔

پار جانے کے لئے نہر پر شاہان مغلیہ کے وقت کا پل بنا ہوا تھا۔ یہ نہر بہت چوڑی اور دریا کا ہم پلہ تھی۔ اس نہر کے کنارے الگ تھلگ میرا اسکول تھا۔

عموماً شام کے وقت مست رام اپنے دو چار نگی ساتھیوں کو لیکر میرے پاس آیا کرتا تھا۔ جو طرح طرح کی بے سروپا خبریں سناتے اور بے تکی ہانکا کرتے۔ اسی طرح ایک شام کو ہم لوگ اسکول کے احاطہ میں جس کے ایک طرف باغیچہ بھی تھا بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ رات کی رانی کی بھینی بھینی خوشبو سے احاطہ مہک رہا تھا اور مست رام سرور کی حالت میں بیت پڑھنے لگا۔

اتنے میں اس کا ایک اور چرسی دوست آ گیا جسے مست رام نے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مگر وہ کھڑا رہا اور سر کھجلاتے ہوئے کہنے لگا "یار بڑے بیت باز بنے ہوئے بلبل کی طرح چہک رہے ہو کچھ لسبنت کی بھی خبر ہے" مست رام بیت کو ادھورا چھوڑ کر حیرت سے پوچھنے لگا۔ یار کیا بات ہے۔ اس چرسی نے

٦٦

کہا "سنا ہے کہ مظفر گڑھ اور غازی گھاٹ میں لوگ دھڑا دھڑ پلیگ سے مر رہے ہیں" میں نے کہا "ہاں اس کے متعلق آج میں نے بھی اخبار میں پڑھا ہے۔"

یہ خبر سنکر سب کے سب سہم گئے "اب کیا ہو گا ماسٹر جی" سب نے پریشانی سے کہا۔ میں نے جواب دیا "خدا رحم کرے۔ اگر زندگی ہے تو کوئی خطرہ نہیں"۔ وہی چودھری کہنے لگا "خدا اب کیا رحم کریگا۔ دنیا تھوڑے ظلم کر رہی ہے کلجگ ہے ماسٹر جی کلجگ۔ ابھی تھوڑے ہی دن گزرے۔ کہ ایک گائے بیچاری سڑک کے درمیان کہیں جا بیٹھی۔ ادھر سے لاری آ رہی تھی۔ تو لاری والے اندھے نے اس کے اوپر لاری چڑھا دی۔ جس سے گائے کی ٹانگ ٹوٹ گئی مگر لاری والے کو کسی نے پوچھا تک نہیں۔

اگلے دن پنڈت کا لڑکا ایک اچھوت عورت بیاہ لایا۔ سنا ہے کہ وہ کہیں تماشے میں رانی کا روپ بھرا کرتی تھی۔ وہیں اس پر ریجھ گیا اور اسے گھر ڈال لیا۔ ابھی پرسوں کی بات ہے کہ بھولا ناتھ کا ایک جوگی جو کہیں باہر سے آیا تھا۔ شامت کا مارا چودھری متھرا داس کے گھر چلا گیا اور شہری طریقے سے ناواقف ہونے کے باعث اندر جا گھسا۔ کمرے میں اس وقت چودھری متھرا داس کا چھوٹا لڑکا جو نیا نیا ولایت پاس کر کے آیا ہے۔ اپنی میم کے ساتھ بیٹھا رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ وہ جوگی کو دیکھتے ہی غیظ و غضب سے دیوانہ ہو گیا۔ اور چوہ رکھہ کر جوگی کو پکڑ لیا۔ پھر چمڑے کی چھڑی سے اس قدر پیٹا کہ وہ ادھ موا ہو گیا۔ مگر جوگی نے بھی اُسے بڑے سراپ دیئے۔ رام رام جوگی کا سراپ بھی

اٹل ہوتا ہے۔ جوگی کی زبان کالی ہوتی ہے۔ جو ظالم کو نشٹ کر دیتی ہے۔" وہ دیر تک نمک مرچ لگا کر اس قسم کی باتیں کرتا رہا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے نئی نئی افواہیں اڑتی رہیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ پلیگ مظفر گڑھ اور غازی گھاٹ کے علاوہ دیہات میں بھی پھیلنی شروع ہو گئی۔

بیساکھ کے آخری دن تھے۔ صحرا کی شفق آلود شام تھی۔ نیم گرم ہوا کے جھونکے بور سے لدے ہوئے آم کی ڈالیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ کوئل اپنی پردرد آواز میں کوکو کا شور مچا رہی تھی۔ میں چبوترے پر چارپائی ڈالے میٹھا حقے کے کش لگا رہا تھا کہ اتنے میں مست رام بھی آ گیا۔

"کچھ آپ نے بھی سنا ماسٹر جی" اس نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں تو۔ کیا کچھ نئی خبر لائے ہو۔" میں نے پوچھا۔ مست رام نے کہا "ہاں ماسٹر جی لوگ کہتے ہیں کہ موضع لوہڑی میں ایک ڈنگہ ترے کی عورت کے بچے کی بجائے بلا پیدا ہوئی ہے جو پیدا ہوتے ہی بولنے لگی ہے۔ اس نے اپنے گھر کے لوگوں سے کہا کہ میں نرک کی چڑیل ہوں۔ جو دنیا کو ہڑپ کرنے آئی ہوں۔ پھر وہ سارے گاؤں میں پھری۔ اور بعد ازاں اس نے من کوٹ کا رخ کیا۔ آہ اب کوئی دن میں اس شہر پر بھی تباہی آنے والی ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ اپنے گرد و پیش اس طرح دیکھنے لگا۔ گویا اسے خطرہ تھا کہ کہیں وہ بلا اس کی یہ باتیں نہ سن لے۔ مجھے اس کی بدحواسی پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "کیوں ماسٹر جی اس میں ہنسنے کی کونسی بات ہے۔" اس نے کھسیانہ ہو کر کہا۔

میں نے کہا "بھئی مست رام۔ بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ پچھلے زمانے میں جب بیماریوں کا نیل پھوٹ جایا کرتا تھا تو وہ ایسی لایعنی داستانیں جوڑا کرتے تھے" وہ چڑ کر کہنے لگا "واہ ماسٹر جی سب باتیں تو جھوٹ نہیں ہوتیں۔ پڑھے لکھے لوگوں میں یہی تو خرابی ہے کہ وہ کسی کی بات کو مانتے ہی نہیں۔ مگر ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں آپ سب کچھ خود دیکھ لیں گے۔ بُرے آثار تو شروع ہو ہی گئے ہیں۔

میں نے اکتا کر کہا "اچھا جو کچھ دیکھنا ہے بعد میں خود ہی دیکھ لوں گا۔ مگر وہ آثار جو تمہارے سوا کوئی دوسرا نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے ابھی دکھا دو" مست رام نے متانت سے کہا "تو کیا آپ نے رات کو کبھی کتّوں کا رونا نہیں سنا۔ وہ آجکل ایسی خوفناک آواز سے روتے ہیں کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور گنی لوگوں کا قول ہے کہ رات کو آسمان سے بلائیں اترتی ہیں جنہیں کتّا اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھ کر چیختا چلاتا ہے" مست رام کے کہنے پر فوراً مجھے ایک ایک دن پہلے کا واقعہ یاد آ گیا۔ کہ رات کو اتفاقاً میری آنکھ کھلی۔ تو اس وقت باہر ایک کتا منحوس آواز میں لمبی لمبی چیخیں لگا رہا تھا۔ جس کا میرے دل پر بہت ناگوار اثر ہوا۔ اور پھر تمام رات نیند نہ آئی۔ تاہم میں نے بے پروائی سے کہا۔ "اوہنہ یہ کوئی بڑی بات نہیں کتّے ہمیشہ رویا کرتے ہیں۔ یہ بُرے آثار کی کوئی معقول دلیل نہیں۔ مست رام نے زچ ہو کر کہا "اچھا نہ سہی۔ لیکن یہ تو بتایئے آپ نے آسمان پر کبھی پہلے اتنی سرخی دیکھی تھی۔ پرانے زمانے کے لوگ کہا کرتے تھے کہ جب کسی بے گناہ کو سولی چڑھایا جاتا تھا تو سرخ آندھی آتی تھی۔ مگر

اب تو آندھی بھی نہیں۔ اور آسمان بلا وجہ خونِ کبوتر ہو رہا ہے۔ اگر یہ بدشگونیوں کے آثار نہیں تو اور کیا ہیں؟"

ایکدم میری نظر سامنے کی طرف اُٹھی۔ نہ جانے واہمہ کا اثر تھا یا سچ مچ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ لمبا چوڑا صحرا آسمان کی سرخی سے لہو لہان ہو رہا ہے بلکہ نہر کا پانی بھی سرخ بانات کی چادر کی طرح ہلکورے لیتا اور موجوں کی خونیں سلوٹیں ڈالتا سست روی سے بہہ رہا ہے۔

یہ منظر دیکھ کر میرا دل لرز گیا۔ تاہم میں نے ایک ادنیٰ کے ساتھ بات کو ٹال دیا۔

۳

جیٹھ کا آغاز تھا حسبِ دستور گرمی کا جوش بڑھ رہا تھا دو دن سے میں نے مست رام کو کہیں نہ دیکھا۔ اس لئے سہ پہر کو خود اس کی کٹیا کی طرف گیا۔ اس کی کٹیا گلو کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی صحن میں ایک طرف پانی کا چہ بچہ تھا۔ جہاں اس نے کبوتروں کے لئے لمبی لمبی چھتریاں کھڑی کر رکھی تھیں۔ وہ اس وقت چرسیوں کے درمیان ایک کبوتر کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ سب تعظیم کو اُٹھے۔ ایک چرسی نے فوراً کٹیا سے ایک رنگیلی چارپائی نکال کر بچھا دی۔ میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "بھئی مست رام دو دن کہاں غائب رہے؟" مست رام نے اپنے کبوتر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر جی میرا بچہ ٹوڈر بیمار ہو گیا تھا۔"

میں نے کہا "بچہ ٹوڈر کون۔ کیا تمہاری مراد اس کبوتر سے ہے۔ جسے چھاتی

سے لگائے ہوئے" اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا "ہاں ماسٹر جی یہی میرے بال بچے ہیں۔ ان پر میری جان جاتی ہے۔ یہ خدا کے جی ہیں۔ مجھے ان کی خدمت میں بڑا آنند ملتا ہے۔"

اس کے بعد اس نے اٹھ کر کٹیا سے ایک نیا حقہ نکالا اور بھر کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں حقہ پینے لگا اور اس نے پاؤں دبانا شروع کئے۔ میں نے کہا۔ "بھئی کئی دن سے کوئی تازہ خبر سننے میں نہیں آئی"۔ مست رام نے کہا "ماسٹر جی آج کل تو چاروں طرف پلیگ کی خبریں ہی پھیل رہی ہیں اور غالباً آج یا کل وہ یہاں بھی پہنچ جائے گی"۔ میں نے ہنسکر کہا "وہ کیسے کیا اس نے تمھیں پیغام بھیجا ہے"؟ اس کے جواب میں مست رام نے اپنے ایک چرسی دوست سے کہا۔ اچھا بھئی دھنی تم خود اپنی زبان سے ماسٹر جی کو وہ واقعہ سنائیے۔

دھنی لمبی موچھوں والا شخص تھا۔ جو عام چرسیوں کی طرح مرا ہوا نہ تھا یہ آدمی یکہ چلایا کرتا تھا۔ اس نے پہلے ایک جھرجھری سی لی۔ پھر گول مٹول دیدوں کو پھیلا کر کہنے لگا "وہ ماسٹر جی رام رام کچھ نہ پوچھئے"۔ پھر کافی دیر سوچنے کے بعد بولا "میں روزانہ رات کے ڈھائی تین بجے موضع دوہرہ سے سواریاں لادتا ہوں اور سورج کی پہلی کرن پھوٹتے ہی من کوٹ پہنچ جاتا ہوں۔ میری سواریوں میں زیادہ تر گوالے اور دھوبی وغیرہ ہوتے ہیں جنھیں صبح سویرے ہی اپنے کام پر پہنچنا ہوتا ہے۔

چنانچہ گزشتہ رات جب سواریاں لادنے لگا تو ان میں ایک برقعہ والی عورت بھی تھی۔ میں رات کے وقت اکیلی عورت کو سوار کرنے سے ہچکچانے لگا۔ جس پر

وہ عورت منتیں کرنے لگی۔ ان سواریوں میں موضع لوہٹری کا ایک چٹھی رساں بھی تھا۔ جو رخصت گزار کر کسی گاؤں سے واپس آرہا تھا۔ اور صبح اُسے اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہونا تھا۔ اس عورت کی منت وسماجت پر اُس نے کہا ''بھئی لے بھی چلو اسے۔ یہ بیچاری اب رات کو کہاں بھٹکتی پھرے گی۔ ہم سب بہو بیٹی والے ہیں اسے لے جانے میں کوئی ہرج نہیں۔

چٹھی رساں کے کہنے پر میں نے اُسے سوار کر لیا جس نے مجھے بتایا کہ وہ من کوٹ جائے گی۔ خیر ہم لوگ وہاں سے روانہ ہوئے۔ لیکن رام جانے گھوڑے کو کیا ہو گیا۔ وہ چند قدم چل کر رک جاتا اور بری طرح ہانپنے لگتا۔ گویا منوں بوجھ کے تلے دبا ہوا ہو۔ آخر میں نے تنگ آ کر اس کی لگام پکڑ لی اور قدم قدم اسے چلانے لگا حتیٰ کے لگام کھینچتے کھینچتے میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے اور گھوڑے کا دہانہ بھی زخمی ہو گیا:

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیئے۔ جن پر واقعی چھالے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''اچھا تو پھر کیا ہوا؟'' وہ پھر کہنے لگا کہ اسی طرح میں نے کوئی پانچ کوس کا فاصلہ طے کیا تھا۔ کہ گھوڑا پھر ٹھہر گیا۔ عین اُسی وقت چٹھی رساں نے یکہ سے اُترتے ہوئے کہا کہ میں ذرا پیشاب کر آؤں اور پھر آہستہ سے میرا ہاتھ دبا کر آگے بڑھ گیا۔ اس کا یہ اشارہ پا کر میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔

تھوڑی دور پر ایک درخت کی اوٹ میں جا کر اس نے مجھ سے کہا ''بھئی اس عورت کو تو سوار کر کے ہم نے بڑی غلطی کی۔ کیونکہ وہ انسان نہیں بلکہ کوئی بلا ئی

مخلوق ہے؟" میں نے کہا: "وہ کیسے؟" چٹھی رساں کہنے لگا: "کہ میں اس کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں۔ وہ کسی وقت جوان دکھائی دیتی تھی، کسی وقت بوڑھی۔ کبھی گوری ہو جاتی اور کبھی کالی۔ اس لئے میں نے اسے زیادہ توجہ سے دیکھنا شروع کیا۔ لہٰذا اب معلوم ہوا کہ اس کی داڑھی مونچھیں بھی ہیں میں ڈر کر پیشاب کے بہانے نیچے اُتر آیا۔"

چٹھی رساں کی بات سنکر میرا رنگ فق ہو گیا۔ مگر وہ بڑا دل گردے والا آدمی تھا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ ایسے موقع پر دل چھوڑنا مناسب نہیں اور اس کے بعد وہ پھر یکہ پر سوار نہ ہوا۔ بلکہ گھوڑا پکڑ کر چلانے میں میری مدد کرتا رہا اور اس کی بہت کوشش تھی کہ میرا یکہ پو پھٹتے ہی موضع لوہاری پہنچ گیا۔ جہاں میں نے اپنی سب سواریوں سے کہا، چونکہ میرا گھوڑا بیمار ہو گیا ہے۔ اور میں آگے نہیں جاسکتا۔ اس لئے کرایہ معاف کرتا ہوں۔

سواریاں اُتر گئیں مگر برقعے والی کہنے لگی۔ لالہ اور کسی سے خواہ کرایہ لو یا نہ لو۔ مجھ سے ضرور لے لو۔ یہ کہتے ہوئے اس نے میرے ہاتھ میں ایک نوٹ دیدیا اور قریب کی ایک گلی میں داخل ہو کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد چٹھی رساں نے کہا، "بھئی تم پر تو وہ بہت مہربان تھی۔ دکھاؤ تو کتنے کا نوٹ دے گئی ہے؟"

میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ "ہائیں یہ کیا" اس نے نوٹ کو لالٹین کی روشنی میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو معمولی کاغذ ہے؟" میں تعجب سے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ پر جھک گیا۔ چٹھی رساں نے کہا "ٹھہرو بھئی اس پر تو کچھ لکھا ہوا بھی

ہے۔ اور اس کاغذ کو لالٹین کے بالکل قریب لے جاکر پڑھنے لگا۔

کاغذ کا مضمون بہت لرزہ خیز تھا۔ لکھا تھا کہ یہ تم لوگوں کی خوش قسمتی تھی جو تم نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ میں لاری سے جانا چاہتی تھی۔ مگر تمہارا یکہ دیکھ کر جی میں آئی۔ کہ اسی پر چلی جاؤں۔ جلدی جا پہنچوں گی۔ مگر یہ خیال ہی نہ آیا کہ گھوڑا میرا بوجھ نہ اٹھا سکے گا۔ کیونکہ میں در اصل عورت کے بھیس میں پلیگ تھی لیکن تم لوگ بھی بہادر نکلے۔ جو یکہ کو گھسیٹ گھساٹ کر لوٹھری تک لے آئے ہیں تم لوگوں سے بہت خوش ہوں۔ من کوٹ تو مجھے پہنچنا ہی ہے۔ آج نہ سہی کل سہی تاہم تم لوگوں کی جوانمردی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتی اس کے صلہ میں تم لوگوں کی جاں بخشی کرتی ہوں۔

اس مضمون سے ہمارے ہوش اڑ گئے میں نے وہ کاغذ جیب میں رکھا اور فوراً وہاں سے روانہ ہوا تاکہ من کوٹ جاکر یہ کاغذ لوگوں کو دکھاؤں۔ اب میرا گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے فوراً مجھے من کوٹ پہنچا دیا۔ مگر من کوٹ پہنچ کر جب میں نے وہ کاغذ نکالنے کی خاطر جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب خالی تھی۔

ابھی دھنی اپنا بیان ختم نہ کرنے پایا تھا کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا خس و خاشاک اڑاتا ہوا کٹیا کی دیواروں سے ٹکرایا۔ اوہ۔ کتنی سخت آندھی ہے مستر رام نے نہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تو سچ مچ خوفناک اور سیاہ آندھی بلائے ناگہانی کی طرح تیزروی سے چلی آتی تھی۔ میں بوکھلایا ہوا سکول کی طرف بھاگا۔ مگر میرے پہنچتے پہنچتے ہی ہر طرف دھند کار چھا گیا

یہ آندھی کیا تھی خدا کا قہر تھا۔ بڑے بڑے تناور درخت جڑوں سے اکھڑ گئے

مکانوں کی منڈیریں اور مزدوروں کے چھپر صاف اڑ گئے۔ آم کا بور بالکل جھڑ گیا تمام رات آندھی بڑے زور و شور سے چلتی رہی اور صبح کے قریب بارش کا چھینٹا پڑنے سے اس کا جوش ٹھنڈا ہوا۔

دوسرے دن صبح صبح مست رام میرے پاس آیا اور آتے ہی رات والی آندھی کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ اس آندھی کو پلیگ کا پیش خیمہ تصور کرتا تھا۔ کیونکہ ان دنوں اس کو سوائے پلیگ کا چرچا کرنے کے دوسرا کوئی کام ہی نہ تھا۔ وہ بہت ہراساں تھا میں نے ان توہمات باطلہ سے اس کا خیال ہٹانے کی بہت کوشش کی۔ خیر اسوقت تو وہ کچھ قائل بھی ہو گیا مگر شام کو پھر وہی خبط لئے آدھمکا۔

اس وقت اس کے ساتھ ایک اور چرسی بھی تھا۔ اس نے آتے ہی کہا "ماسٹر جی مہاراج - آج مادھو نے ایک اور تازہ خبر سنائی ہے۔ کیا اسے بھی آپ جھوٹ ہی کہیں گے؟" میں نے کہا "کیسی خبر ہے جلدی بیان کرو" مست رام نے جواب دیا "کہ مادھو خود ہی بیان کرے گا۔ اور اسی لئے اسے ساتھ لایا ہوں۔ کیونکہ میری بات کو تو آپ ہنسی میں اڑا دیتے ہیں۔

مادھو ادھیڑ عمر کا بھٹیارہ تھا جس کے سر پر لمبی سی چوٹی اور کانوں میں سونے کے مندرے پڑے تھے۔ اس نے ایک میلی کچیلی دھوتی پہن رکھی تھی اور گلے سے ننگا تھا۔ یہ کچھ نیم پاگل سا آدمی تھا جس کی شکل و شباہت دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسی آتی تھی۔ لہذا میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا "سناؤ بھئی مادھو کیا بات ہے"

مست رام نے میری تائید کرتے ہوئے کہا "مگر دیکھو خبردار جھوٹ نہ بولنا" مادھو نے پھٹے پھٹے دیدوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پہ

دکھ لئے اور سونے کے مندروں کو پکڑ کر کہنے لگا "مہاراج میں اس بت تو سونے کو چھو کر کہتا ہوں کہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گا" ست رام نے کہا "اچھا تو پھر بیان کرو۔"

مادھو نے کہا "مہاراج۔ دوپہر کو میں حسب معمول بھٹی کے لئے گھاس پھوس جمع کرنے کی خاطر شہر سے باہر گیا۔ اور جب قبرستان کے قریب سے گزرنے لگا تو پیچھے دور سے کسی نے مجھے مادھو مادھو کہہ کر پکارا میں نے سمجھا کوئی جان پہچان والا ہوگا۔ کیونکہ سوائے جان پہچان والے کے کوئی کسی کا نام لیکر کیسے پکار سکتا ہے چنانچہ میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ تو وہاں کوئی بھی آدمی نہ تھا۔ میں آگے بڑھا تو قریب کے کھیت سے پھر آواز آئی۔

بازو پر ہر مل کا کھیت تھا میں اس طرف ہو لیا۔ تو کچھ دور پر ہر مل کے کھیت میں ایک بڑھیا دکھائی دی۔ جو اپنے بدن پر سالونا لئے پڑی تھی اس عورت کا چہرہ اتنا ڈراؤنا تھا کہ میں دہل گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں سخت پیاسی ہوں۔ جلد کہیں سے پانی لاؤ۔ مارے خوف کے میری زبان تالو سے لگ گئی اور میں بول نہ سکا۔

میری اس خاموشی پر اسے بہت غصہ آیا اور اٹھ کر میرے سر پر ایسی چپت رسید کی کہ میں چکرا گیا۔ تو میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "ماتا پانی کہاں سے لاؤں۔ یہاں قریب تو پانی کہیں بھی نہیں" اس نے حکم دیا کہ جا کر نہر سے پانی لا۔ میں بہت بہتر کہہ کر واپس ہوا۔

ابھی میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اس نے پیچھے سے اونچی آواز میں پکار کر کہا۔ "مادھو میرے ساتھ دھوکا نہ کرنا میں پلیگ ہوں اگر تم پانی لے کر نہ آئے

تو تمھاری خیر نہیں" اس کے یہ الفاظ تیر کی طرح میرے دل میں اُتر گئے اور خوفزدہ ہو کر ایسا بھاگا کہ گھر پر آ کر دم لیا۔ اسکی یہ مضحکہ خیز داستان سنکر میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ اچھا تو تم پانی لیکر گئے تھے؟ مادھو نے کہا۔ رام رام پھر وہاں کون جاتا۔ میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا "اچھا مٹی کے مادھو اب وہ تمھیں کبھی زندہ نہ چھوڑے گی۔

میرے اس مذاق سے مادھو زیادہ پریشان ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد کہنے لگا "بھئی مست رام میرے سر میں تو پہلے ہی بہت سخت درد تھا۔ مگر اب تو بدن بھی ٹوٹ رہا ہے۔ مجھے ضرور بخار آئے گا۔ اس لئے مجھے جلد گھر جانا چاہیئے۔ اور تم مہربانی کر کے ذرا گھر تک پہنچا دو۔ کیونکہ اکیلے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ابھی ماسٹر جی بھی کہہ رہے تھے کہ وہ تمھیں زندہ نہ چھوڑے گی

میں نے اس کی حالت دیکھ کر تسلی دی اور مست رام بھی سمجھانے لگا لیکن وہ اسی بات پر اڑا رہا کہ مست رام اسے گھر تک پہنچانے جائے۔ آخر کار اسے مادھو کے ساتھ جانا پڑا۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی مست رام ہاتھوں میں چلم دبائے ہوئے آ کھڑا ہوا۔ اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور بہت دلگیر دکھائی دیتا تھا۔ میں نے کہا "کہو بھئی مست رام خیر تو ہے۔ آج صبح صبح کیسے آنا ہوا" مست رام نے افسوسناک لہجہ میں کہا "ماسٹر جی اب خیر کہاں۔ آج مادھو بھی مر گیا ہے" یہ سنکر میں ہکا بکا رہ گیا اور بے اعتباری سے کہا "ہائیں رات کو تو وہ اچھا بھلا تھا۔ اس قدر جلد کیسے مر گیا" مست رام نے کہا "ماسٹر جی مر تو وہ اسی وقت گیا تھا جس وقت اس کے

سر پر پلیگ نے جھپٹ لگائی تھی۔ میں نے کہا" خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ وہ پاگل آدمی تھا۔ واہمہ کا شکار ہو گیا ہو گا۔ مگر تمہیں اس کی موت کا کیسے پتہ لگا؟" مست رام نے کہا" اس نے آخری وقت میں مجھے بلایا تھا۔ صبح منہ اندھیرے ہی اس کا لڑکا آکر مجھے لے گیا۔ لیکن میرے پہنچنے تک وہ ختم ہو چکا تھا۔ آہ اس کا منہ اور سر سوجا ہوا تھا اس کے گلے میں پلیگ پھوٹی تھی۔

مادھو کی اس اچانک موت سے میں بہت دل برداشتہ ہوا جس کا اثر کئی دنوں تک میرے دل پر رہا۔ اس عرصہ میں مست رام بھی میرے پاس بہت کم آتا رہا اور اگر آتا بھی تو چپ چاپ بیٹھا رہتا غرضکہ ہماری محفل پھیکی پڑ گئی۔

جیٹھ بیت چکا تھا۔ ہاڑ شروع ہو گیا۔ اتوار کے دن میں باغیچے کے قریب چارپائی پر لیٹا تھا۔ ہوائیں گنگنا رہی تھیں۔ آم کی پھلدار ڈالوں پر کوئل کوک رہی تھی۔ ڈاکیہ ڈاک لایا جس میں ایک سرکاری لفافہ تھا۔ کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ انسپکٹر صاحب کا حکم نامہ ہے کہ سکول میں لڑکوں کو پلیگ کا ٹیکہ لگوایا جائے۔

اسی وقت مست رام بھی بھولا بھٹکا آ نکلا۔ میں نے اسے یہ خبر سنائی اس نے کہا" میں بھی تندو تیلی سے ابھی ابھی ایک نئی خبر سنکر آیا ہوں" میں نے کہا "کوئی نیک خبر ہے؟" اس نے کہا" نندو کہتا تھا کہ پرسوں رات کو چودھری درگا داس کسی اپنے کام کے واسطے تحصیلدار سے ملنے گیا۔ جہاں باتوں میں اسے بہت دیر ہو گئی۔ نصف شب کے قریب جب وہ واپس آیا۔ تو تحصیل کے نکڑ پر اسے ایک عورت ملی۔ جو دہاڑیں مار کر رو رہی تھی۔ اس کی آواز بہت درد ناک تھی۔ اس نے چودھری سے خیرات مانگی۔ آدھی رات اور سنسان سمے میں اس کی

مگر وہ آواز کا چودھری پر بہت اثر ہوا۔ اُس نے کچھ زرِ نقد عورت کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ مگر عورت نے وہ پیشکش قبول نہ کی۔ اور کہا کہ میں بھوکی ہوں مجھے کھانے کو کچھ دو۔ چودھری نے نرمی سے کہا۔ یہاں میرے پاس کچھ نہیں۔ البتہ اگر میرے ساتھ گھر چلو گی تو ضرور تمہیں پیٹ بھر کر کھانا کھلا دوں گا۔

چودھری کا جواب سنکر وہ عورت کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ اور پھر بولی نہیں میں تمھارے گھر نہ چلوں گی۔ کیونکہ تم بھلے آدمی ہو۔ بس اتنا کہتے ہی اس کا قد لمبا ہونے لگا۔ یہ حالت دیکھ کر چودھری کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور بے تحاشا وہاں سے بھاگا۔ اب سنا ہے وہ یگیہ کی تیاری کر رہا ہے۔"

جبر مست رام تھوڑی دیر بعد چلا گیا۔ اُسی دن سہ پہر کو چند آدمی پوری حلوا تقسیم کرتے ہوئے میرے پاس بھی آئے اور دو دونے انھوں نے مجھے بھی دیئے میں نے پوچھا "یہ کہاں سے آئے ہیں؟" انھوں نے کہا "چودھری درگا داس کے ہاں سے۔" میں نے کہا "کیا تقریب ہے؟" انھوں نے جواب دیا "کہ چودھری جی نے یگیہ رچایا ہے۔" میں نے کہا "کیوں؟" انھوں نے ہنسکر جواب دیا۔ "ان کی مرضی"۔ میں لاجواب ہو گیا۔ اور دونے چپکے سے اٹھا کر رسویا کے حوالے کر دیئے۔

۴

رفتہ رفتہ من کوٹ بھی پلیگ کی زد میں آ گیا۔ اور وبا نے اس سختی سے حملہ کیا کہ من کوٹ میں گویا اندھیر مچ گیا۔ موت اتنی ارزاں ہو گئی کہ راستے میں چلتے چلتے انسان گر کر مر جاتے۔ اور کوئی ان کو اٹھانے والا تک نہ رہا۔ گھروں کے گھر ویران پڑے تھے۔ اکثر لوگ بھاگ چکے تھے۔ اور باقی کثرت اموات کی بدولت

مردوں سے بدتر ہو رہے تھے۔ غرضیکہ ہر طرف ہراس اور ابتری پھیلی ہوئی تھی۔

ہمارے سامنے بھی نہر کا پل تھا جس پر سے ہر روز جوق در جوق خلقت بھاگتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ ایک دن میں اور مست رام دونوں بیٹھے ہوئے اس وحشت خیز منظر کو نہایت افسوس سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا "بھلا یہ لوگ بھاگ کر جائیں گے کہاں۔ پلیگ تو چاروں طرف آگ کی طرح پھیل چکی ہے" مست رام نے کہا "یہ لوگ ضرور بچ جائیں گے کیونکہ یہ نگر جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "وہ نگر کونسا اتنا دور ہے جو اتنے آدمیوں کے اجتماع کے باوجود پلیگ سے محفوظ رہ سکے" مست رام نے کہا "نہیں وہاں پلیگ نہیں جا سکتی۔ ہاں اتنے آدمیوں کے اجتماع سے فساد کا ضرور خطرہ ہے" میں نے کہا "نگر پلیگ کیوں نہیں پھوٹ سکتی۔"

مست رام نے جھوم کر کہا "وہ رسیلے کی نگری ہے ماسٹر جی رسیلے کی۔ جس کا نام سنتے ہی پلیگ رفو چکر ہو جاتی ہے" میں نے تعجب سے کہا "رسیلے کی نگری۔ وہ رسیلا کون ہے" مست رام نے کہا "ماسٹر جی رسیلا ایک بھاگوان پرش تھا۔ جتی ستی سا۔ گنی آدمی تھا۔ بلوان تھا۔ ایشور کا روپ تھا۔ ایک وقت میں اس نے پلیگ کو اپنی قوت بازو سے زیر کیا تھا" میں نے اشتیاق سے کہا "وہ کیسے" مست رام کہنے لگا یہ بہت لمبا قصہ ہے جو پھر کسی وقت سناؤں گا۔ اس وقت میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ اب جاتا ہوں۔

آخر کار چند دن کے اندر ہی شہر قریباً خالی ہو گیا۔ سکول پہلے ہی سے بند تھا۔ ہر طرف ویرانی اور سنسنی پھیل رہی تھی۔ ہر طرف دھول محیط رہتی تھی۔ اور

نامعلوم طور پر آہ و بکا کی آوازیں گونجتی محسوس ہوتی تھیں۔ میں انسپکٹر صاحب کے حکم کا منتظر تھا۔ اور دعائیں مانگ رہا تھا کہ جلد رخصت کا حکم ملے۔ تاکہ بستر گول کروں۔

مست رام نے بھی میرے پاس آنا جانا بہت کم کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ ان دنوں بہت ہراساں تھا۔ اور اپنی زندہ دلی قطعی طور پر بھول چکا تھا۔ دو دن سے میں بھی بہت پریشان تھا۔ کیونکہ میرا رسویا بھاگ گیا تھا۔ اور کھانا مجھے اپنے ہاتھ سے تیار کرنا پڑتا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمیوں کی لمبی دوپہر جس کو ثقل دوپہر کہنا زیادہ موزوں تھا۔ میں نے خود چولھا جھونکا۔ اور کچا پکا کھانا زہر مار کر کے اندر کمرے میں بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹ کر پنکھا جھلنے لگا۔

پشت کی طرف کھڑکی تھی جس پر کثرت سے گلو کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں گو باہر لو کے آتشیں جھونکے بدن کو جھلساتے تھے۔ مگر گلو کی پتیوں سے چھن کر اندر آنے والی ہوا قدرے ٹھنڈی اور خوشگوار تھی۔ میں اپنے دھیان میں لیٹا تھا۔ کہ باہر سے کسی کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی جس سے میں چونک اٹھا۔ اور پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

اُف خدا بچائے۔ کھڑکی کے باہر مجھے ایک نہایت مکروہ چہرہ دکھائی دیا یہ چہرہ ایک ضعیف عورت کا تھا جس کا رنگ مٹیالا تھا۔ اور منہ پر جا بجا سیاہ دھبے پڑے تھے۔ آنکھیں اُبھری ہوئی اور سرخ تھیں۔ یہ عورت غصیلی آواز میں خود بخود بڑبڑا رہی تھی۔ میں نے نفرت سے کہا۔ "تم کون ہو؟" بڑھیا نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ہم ہیں۔"

اُس کے بے باکانہ جواب پر میں حیران رہ گیا۔ تاہم اُسے جھڑک کر

کھڑکی سے ہٹ جانے کو کہا جس پر وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ اور میں نے فوراً اٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔ لیکن جب واپس چارپائی کی طرف آیا۔ تو اُسے سامنے دروازے پر کھڑا پایا۔

اُس نے ایک بدرنگ سا لہنگا اور چولی پہن رکھی تھی۔ اور سر سے ننگی تھی سر کے بال جو خشک ہو کر جٹاؤں کی شکل میں ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے تھے مٹی سے اٹ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ خاص طور پر بدنما اور غلیظ تھے۔ انگلیاں کچھ عجیب طرز کی ٹیڑھی اور ٹوٹی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔

نہ جانے اس بڑھیا کو دیکھ کر کیوں میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور میں نے نرمی اختیار کرتے ہوئے کہا "کیوں مائی کیا چاہتی ہو" بڑھیا نے جواب دیا "تھارا سر صدقہ" میں نے کہا "میرے پاس تو اس وقت کچھ بھی نہیں۔ میرا بسو پاکل سے بھاگا ہوا ہے۔ خود کھانے سے ناچار ہوں" بڑھیا نے خشک لہجہ میں جواب دیا "میں بھی تو ناچار ہوں۔ تمام شہر خالی پڑا ہے۔ اگر کچھ دیدو گے تو تمھارا ہی بھلا ہے۔ لیکن تم لوگ جان تو دے دیتے ہو تاہم اس کی قیمت نہیں دے سکتے" بڑھیا کی گفتگو سے میں حیران رہ گیا۔ کیونکہ اس کا انداز گفتگو سر بسر تحکمانہ تھا وہ بجائے التجا کے دھمکی دے رہی تھی۔

میں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو اس کی شکل و صورت میں کچھ ایسی ناپاک اور شیطانی جھلک دکھائی دی۔ جس سے گھبرا کر میں نے کہا "مائی بھی یہ کمرہ تمھارے سامنے پڑا ہے۔ جو چاہو لے سکتی ہو" بڑھیا آگے بڑھی۔ اور برتنوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ مٹی کے ایک برتن میں کھونٹے سے کالے

ماش پڑے تھے۔ جو اس نے لہنگے کے پلہ میں باندھ لیے پھر تپائی سے چابیاں اُٹھا کر میرا کیش بکس کھولنے لگی۔ یہ دیکھ کر مجھے نقد جانے کا اندیشہ ہوا۔ لیکن روکنے کی ہمت نہ پڑی۔

کیش بکس میں ڈیڑھ سو کے قریب روپیہ تھے۔ مگر اس نے صرف ایک پیسہ اُٹھایا اور باہر نکل گئی۔ میں ہکا بکا ابھی اسی طرح کھڑا تھا۔ اور کیش بکس بھی بدستور میرے سامنے کھلا پڑا تھا۔ کہ عین اسی وقت باہر سے مست رام کی آواز سنائی دی۔ وہ پریشان گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ اور بے صبری سے کہنے لگا "کیا وہ یہاں آئی تھی؟" میں نے پوچھا "کون؟" مست رام نے جواب دیا "پلیگ آہ۔ میں نے اس سے سخت کلامی کی؟"

مست رام کی زبانی پلیگ کا نام سن کر میرا دل دھک دھک کرنے لگا میں نے خوفزدہ ہو کر کہا "پلیگ تو نہیں ایک بڑھیا بھکارن آئی تھی" اس نے کہا "وہ کہاں ہے؟" میں نے کہا "چلی گئی"

"آہ کدھر گئی"۔ اس نے بدحواسی سے کہا۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی۔ تو اس نے پوچھا "تم نے اسے کیا دیا؟" اس پر میں نے سارا واقعہ سنایا کہ کس طرح آئی اور کس طرح خیرات لے کر رخصت ہو گئی۔

وہ کف افسوس ملتے ہوئے بولا "بس اب تو اس کے پلیگ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ دیکھا اس نے صدقہ میں آپ سے صرف کالے ماش اور تانبے کا پیسہ لیا۔ یہی دو چیزیں تو ہی تو صدقہ کے لیے مخصوص ہیں۔ اُف اب میری خیر نہیں"

میں اس کے بڑھتے ہوئے اضطراب کو دیکھ کر تسلیاں دینے لگا۔ حالانکہ خود میرے دل میں بھی ہول اُٹھ رہا تھا۔ وہ اسی طرح غم والم میں کھویا ہوا واپس چلا گیا۔ اور میں اُس روز بہت مغموم رہا۔ شام کے قریب میں اُس کی کٹیا کی طرف گیا۔ مگر وہ وہاں نہ ملا۔ وہ وہمی طبیعت کا آدمی تھا۔ اسی لیے مجھے خطرہ تھا کہ وہ کہیں واہمہ کا شکار نہ ہو جائے۔ اسی خیال میں میں نے رات کو بھی بُرے بُرے خواب دیکھے۔ مگر شب کی آخری ساعتوں میں جب مست رام نے گانا شروع کیا (وقت نہیں آونا ویس پیارے کھیڈن دے دن چار) تو جان میں جان آگئی۔

صبح اشنان سے فارغ ہو کر میں پھر مست رام کی کٹیا کی طرف گیا وہ گھٹنوں پر سر رکھے آنگن میں بیٹھا تھا۔ مجھے دور سے دیکھتے ہی چلّا کر کہنے لگا۔ "ماسٹر جی ادھر مت آنا ابھی میری کٹیا میں ایک مردہ چھپا پایا گیا ہے۔" میں نے مضطرب ہو کر کہا "تو پھر تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ آؤ ادھر میرے مکان پر چلو۔ تمھارا یہاں رہنا اچھا نہیں" اس نے کہا اچھا ابھی نہا کر آتا ہوں۔ آپ جائیے۔"

میں سکول میں آکر اس کا انتظار کرنے لگا۔ مگر وہ کہیں غائب رہا۔ آخر شام کو وہ میرے پاس آیا۔ آج اُس نے نئے کپڑے پہنے تھے۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھوں کے گلابی ڈوروں گویا نشہ کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ اسوقت ایک شکیل جوان دکھائی دیتا تھا۔

وہ آتے ہی بستر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اور تھکاوٹ کا اظہار کرنے لگا میں نے کہا۔ "بھئی کہاں رہے۔ میں صبح سے تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔" اس نے کہا "وہ کمیٹی والے کٹیا کی صفائی کرنے آ گئے تھے پھر مجھے پکڑ کر کمیٹی لے گئے۔ جہاں انھوں نے تمام دن بٹھائے رکھا اور اب ٹیکہ لگوا کر خلاصی ہوئی۔ میں ادھر سے آتے ہی آخری سلام کیلئے

آپ کے چرنوں میں حاضر ہو گیا ہوں۔"

میں نے تعجب سے کہا۔ "تو تم بھی کہیں جا رہے ہو؟" اُس نے کہا۔ "ہاں سمّن جو آچکا ہے اب تو جانا ہی پڑے گا۔" میں نے پوچھا۔ "کیسا سمّن؟" مست رام نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "یہی مردہ چہ ہا۔" میں نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "جانے بھی دو۔ وہم کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔ ابھی تمھاری عمر کیا ہے۔ ذرا آئینہ کیا تو دیکھو۔ نئے کپڑے پہنکر کتنے بھلے معلوم ہوتے ہو؟" مست رام نے بدستور غمگین لہجہ میں کہا۔ "ہاں اسی کو تو موت کا جوبن کہتے ہیں ورنہ آپ جانتے ہیں کہ میں ایک کریہہ المنظر آدمی ہوں۔ ماسٹر جی مجھے دنیا چھوڑنے کا کچھ غم نہیں صرف اُن بے زبان جانوروں کا خیال ہے۔ جو بیچارے کل تک لاوارث ہو جائیں گے۔"
میں نے اکتا کر کہا۔ "اچھا یہ ذکر چھوڑو۔ اسوقت کوئی پھڑکتا ہوا گیت سناؤ۔"

میرے اصرار پر مست رام نے سوز و گداز سے بھرا ہوا ایک ایسا گیت شروع کیا۔ جو پچھلے زمانے میں دلہن کی رخصت کے وقت گایا جاتا تھا۔ اسکی دردبھری آواز بلند ہوتے ہی فضا میں ایک اُداسی کی لہر دوڑ گئی۔ ان غمگین اور الوداعی نغمات کے اثر سے ایسا معلوم ہونے لگا۔ گویا ہزاروں بے بس دلہنیں اپنی مسرت بھری آرزو دنیا کھو کر سسرال کے مایوس کن اور تاریک ماحول میں دھکیلی یا ہزاروں مسافران عدم (جنکی رنگین اور دلچسپ زندگیاں فرشتہ اجل نے جبراً ختم کر لی ہوں) شمشان بھوم کی طرف روانہ ہیں۔ مجھ پر بے اختیار رقت طاری ہو گئی اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

کچھ دیر بعد مست رام نے گانا ختم کیا اور اپنی کٹیا میں واپس چلا گیا۔ کیونکہ رات بھر اُسے اپنے کبوتروں سے جدا رہنا گوارا نہ تھا۔ چاندنی رات تھی میں بھی اپنا دل بہلانے کی خاطر نہر پر چلا گیا۔ اور رات کو دیر سے واپس آیا۔ چبوترے پر چارپائی بچھی ہوئی تھی

بستر لگا کر لیٹ گیا۔

آج رات بہت گرم تھی۔ ہوا بند ہونے کی وجہ سے سخت اُمس ہو رہا تھا۔ سناٹا کہ صامت آسمان کے عین درمیان چاند گوہر شب تاب کی طرح چمک رہا تھا جس کی خاموش کرنیں درختوں کی گھنی تاریکیوں کو چیر کر تھکی ماندی شکستہ حال دھرتی کے میلے خاکستری دامن پر روپہلی نقش و نگار بنا رہی تھیں۔

دفعتاً ماحول کچھ ایسا گم سم اور چپ چاپ ہو گیا کہ میرا دل خود بخود کسی نامعلوم وحشت اور پوشیدہ خوف سے دھک دھک کرنے لگا۔ میں حیران تھا کہ اس روح فرسا سناٹے میں کونسی ایسی بے چینی اور تلملاہٹ نہاں ہے۔ جسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں مگر دل شدت سے محسوس کر رہا ہے۔

نہ جانے اس قیامت خیز رات کے خطرناک لمحوں میں کونسی مخفی قوت کسی کوشش میں مصروف تھی۔ کونسی پراسرار ہستیاں اِدھر اُدھر چل پھر رہی تھیں۔ کونسی غائبانہ لاہوتی مخلوق کی آمد پر ایسا ہنگامۂ خاموش برپا تھا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ وہ ماحول کیوں اتنا مسموم ہو رہا تھا جس کے جانکاہ اثر سے میری حالت دم بدم بگڑ رہی تھی۔

آخر میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور چندو بھنگی کو آواز دی۔ جو چبوترے کے قریب ہی چارپائی پر پڑا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ فوراً اُٹھا اور کہنے لگا "مالک میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا ہوں۔" میں نے کہا "چندو خدا جانے مجھے کیا ہو رہا ہے میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔"

چندو میرے قریب کھڑا اپنے ہاتھوں کو زور زور سے مل رہا تھا (جیسی کہ اس کی عادت تھی) میں نے کراہتے ہوئے پھر اسے مخاطب کیا۔ اس نے کہا "مالک میرا بھی یہی حال ہے۔" میں نے نڈھال ہو کر کہا "تو ایسا کیوں ہو رہا ہے" اس نے جواب دیا۔ مالک وجہ

تو جانتا ہوں مگر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کیونکہ میں بے علم آدمی ہوں ممکن ہے کہ میرا قیاس غلط ہو"
میں نے گھبرا کر کہا۔ "ہاں ہاں وہ وجہ ضرور بتاؤ۔ یہاں علمیت کا سوال نہیں۔ تجربہ علیحدہ چیز ہے" چندو نے ایک طویل سکوت کے بعد کہا "مالک کئی برس گزر گئے۔ میں اس وقت جوان تھا اور میرا باپ بھی زندہ تھا۔ ہم لوگ اپنے گاؤں میں رہتے تھے۔

ہمارے گاؤں کے چودھری کی دوسرے گاؤں کے چودھری سے سخت دشمنی تھی اور اُسے چوری کا خطرہ تھا۔ لہٰذا اُس نے مجھے چوکیداری پر ملازم رکھا۔ میرا باپ بہت بوڑھا آدمی تھا۔ اور اُسے بےخوابی کی شکایت رہتی تھی۔ اس لئے وہ اکثر رات کو میرے ساتھ چودھری کی حویلی پر چلا آتا۔ تاکہ رات آسانی سے کٹ جائے۔

چنانچہ ایک رات جب ہم دونوں باپ بیٹے آپس میں باتیں کر رہے تھے تو ایسا ہی سماں چھا گیا اور اسی طرح ایک پرہیبت خاموشی اور جانسوز پژمردگی طاری ہوگئی۔ میں بہت ہی خوفزدہ ہوا۔ مگر میرے باپ نے کہا "بیٹا حوصلہ کرو اور بھجن گاؤ۔ کیونکہ اس وقت کوئی پوتر روح دنیا سے جا رہی ہے۔ جس کی پیشوائی کے لئے معمولی یم دوتوں کے علاوہ ان کا سردار بھی آیا ہے۔

غرضکہ ہم دونوں بھجن گانے لگے۔ اور کچھ دیر بعد یہ کیفیت خودبخود زائل ہوگئی آخر صبح معلوم ہوا کہ رات کو قریب ہی کے گھر میں بیچاری کی نوجوان اندھی کنیا گزر گئی ہے
میں نے متوحش ہو کر کہا "تو کیا اس سے تمھاری مراد یہ ہے کہ یہاں بھی گردوپیش کوئی موت واقع ہونے والی ہے" "جی ہاں ضرور" چندو نے بڑے وثوق سے کہا "اسوقت کوئی پوتر روح دنیا سے جا رہی ہے جس کی خاطر خود موت کا فرشتہ یم دوتوں کے پورے لشکر سمیت وارد ہوا ہے۔ یہ اسی کے پروں کی ہلکی جنبش سے مہیب خاموشی۔ اور

لرزہ خیز کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔

چندرو کی اس گفتگو سے میرے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔ میں فرطِ خوف سے بے حال ہو کر چارپائی پر گر گیا۔ اور کانپتی ہوئی آواز سے کہا "آہ وہ فرشتہ شاید میری ہی روح قبض کرنے کو آیا ہے۔" چندرو نے دعائیں دیتے ہوئے کہا "مالک ایسی بات نہ کہو ابھی کوئی دم میں یہ سختی رفع ہو جائیگی۔ آؤ وہی بھجن گائیں۔ جو ایک ایسے ہی وقت میں میں نے اپنے باپ کے ساتھ گائے تھے۔"

غرضکہ اس نے نہایت عقیدت اور جوش سے بھجن گانا شروع کیا۔ ساتھ میں بھی لڑکھڑاتی زبان اور کمزور آواز میں اس کے ساتھ بھجن گاتا رہا۔ مگر باوجود اس کے کئی گھنٹے تک وہ حالت بدستور قائم رہی۔ رات اتنی لمبی ہو گئی کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی مست رام بھی آج ایسا خاموش تھا کہ جیسے راگنی آسا چھیڑنا بالکل بھول چکا ہو۔

آخر خدا خدا کر کے یہ کافر رات ختم ہوئی۔ صبح کاذب کی ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ بے حس و حرکت درخت آہستہ آہستہ انگڑائیاں لیتے ہوئے گہری نیند سے جاگے برگ و بار کے مردہ تنوں میں گویا جان سی پڑنے لگی۔ اور ماحول تبدریج سکون پذیر ہونے لگا۔ میرے دماغی انتشار اور دلی ہیجان میں بھی کمی ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ نیند آ گئی۔

آنکھ کھلی تو سورج میرے سر پر چمک رہا تھا جس کی ہر کرن تپی ہوئی سلاخ بنکر جسم کو داغ رہی تھی۔ میں کلبلا کر اٹھ بیٹھا چندرو اسوقت اپنے کام سے فارغ ہو کر حقہ پی رہا تھا مجھے بیدار پا کر میرے پاس آ گیا۔ اور مزاج پرسی کے ساتھ ساتھ حسبِ معمول اپنے ہاتھوں کو زور زور سے ملنے لگا جس کا مطلب تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر ہچکچا رہا ہے میں نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے کہا "اگر تم کچھ کہنا چاہتے ہو تو بے شک کہہ دو۔"

مالک اس نے دھیمی سے کہا" رات کو جو بات میں نے کہی تھی بالکل سچی ثابت ہوئی۔" میں نے اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر کہا" یعنی" اس نے جواب دیا۔ یعنی رات کو ایک بھلا آدمی دنیا سے رخصت ہو گیا۔" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "وہ کون؟" چندو بولا" مست رام۔" میں نے بدحواسی سے چلا کر کہا" کیا مست رام مر گیا۔" "ہاں مالک ابھی اس کی لاش کبھٹی والے اٹھا کر لے گئے ہیں اس نے افسوس سے کہا۔"

مست رام کی موت کی خبر ایک زبردست آہنی ہتھوڑے کی ضرب کی طرح میرے دماغ پر لگی۔ میں دیر تک دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ اُس دن بارہ بجے کی ڈاک میں مجھے انسپکٹر صاحب کا حکمنامہ ملا۔ کہ میں سکول بند کر کے چھٹی پر چلا جاؤں۔ لہٰذا اُسی دن میں روتا دھوتا اپنے گھر چلا آیا۔

۵

اس واقعہ کے چند ماہ بعد موضع ٹکر جانے کا اتفاق ہوا مجھے مست رام کے وہ الفاظ یاد تھے کہ ٹکر کے قریب رسیلی نگری ہے جس نے پلیگ کو قوت بازو سے زیر کیا تھا۔ رات کو میں چودھری گاندھرام کی حویلی ہی میں ٹھہرا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے بوڑھے چودھری سے رسیلے کا قصہ سننے کی خواہش ظاہر کی۔

کاتک کا مہینہ تھا صحرائی گرمی کا جوش کسی حد تک سرد پڑ چکا تھا ہلکی ہلکی معتدل ہوائیں چل رہی تھیں۔ دریچوں سے باہر وسیع و لامحدود صحرا۔ رات کی خاموشی اندھا ریک آغوش میں گہری نیند سو رہا تھا۔ تاروں کی کثرت سے آسمان سیاہ و مقیشی چادر میں لپٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہم دونوں پرانی حویلی کے کوٹھے پر (جس کے کونوں میں کلسوں پر بڑے بڑے روغنی آبدان نصب تھے) آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

بوڑھا چودھری گہری سانس لے کر کہنے لگا کسی زمانہ میں ہمارے گھر ایک بوڑھا مصری دیوی ناتھ رہتا تھا۔ یہ میرے باپ کے وقت کا بہت نیک اور وفادار ملازم تھا "رسیلا" اس کے بڑھاپے کی اولاد تھا۔ اس لئے بوڑھا مصر اسے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ جب رسیلا نے زندگی کی ساتویں سیڑھی پر قدم رکھا تو بوڑھا مصر چل بسا اور مرتے وقت اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے گیا۔

بوڑھی مصرانی بہت سمجھدار عورت تھی۔ اس نے میرے گھر کا کام کاج سنبھال لیا۔ ادھر رسیلے کو میں نے پاٹھ شالہ میں داخل کرا دیا۔ رسیلا بڑا ہونہار اور محنتی لڑکا تھا۔ دوپہر کو جب پاٹھ شالہ سے واپس آتا تو بڑی محبت سے ماں کا ہاتھ بٹاتا۔ بلکہ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے کاموں میں بھی نہایت شوق سے حصہ لیتا۔ اور اپنی حسن لیاقت سے وہ بہت جلد گھر بھر میں عزیز ہو گیا۔ رادھا کے سوائے گھر کے تمام افراد اس سے خوش تھے۔

میری اکلوتی بیٹی رادھا اسوقت بارہ سال کی تھی یہ بہت تند اور تلخ مزاج کی لڑکی تھی۔ رسیلے کے ساتھ اسے خدا واسطے کی دشمنی تھی۔ یہ اسے اپنا حریف سمجھتے ہوئے اکثر بلا وجہ ہی اسے پیٹ ڈالتی تھی۔ بڑھی مصرانی زبان سے تو کچھ نہیں کہتی تھی مگر اس کی غمناک آنکھوں کو دیکھ کر میں رادھا کی سرزنش کئے بغیر نہ رہتا تھا۔ اس لئے رادھا کی عداوت روز بروز بڑھتی گئی اسی طرح دن گزرتے گئے حتیٰ کہ رسیلا چودہ سال کا ہو گیا۔ رادھا اس وقت بیس سال کی تھی اس کی شادی میں نے ایک امیر گھرانے میں کی تھی۔ مگر وہ چھٹے سال ہی ودھوا ہو کر ہمارے گھر واپس آ گئی۔ مگر رسیلا پہلے سے زیادہ جانفشانی سے اس کی خدمت کرنے لگا۔ مگر وہ بدستور اس کی مخالف رہی۔

رفتہ رفتہ رسیلا جوان ہوتا گیا جوان بھی ایسا جس کو درشنی جوان کہنا زیادہ موزوں

تھا جس طرف نکل جاتا انگلیاں اٹھنے لگتیں۔ گاؤں کی لڑکیاں اسکی راہ میں آنکھیں بچھاتی تھیں گاؤں کے لڑکے اس کی دوستی پر فخر کرتے اور بڑے بوڑھے اس کو دعائیں دیتے تھے۔ وہ مردانہ حسن کا بہترین نمونہ تھا۔ اس کی شکل و صورت میں کچھ ایسا شہاناپن تھا۔ کہ سادہ لباس میں بھی راجکمار دکھائی دیتا تھا۔ اب میں نے بجائے گھر کے کاموں کے باغات کا انتظام اس کے سپرد کر رکھا تھا جس کے حسن انتظام سے میری آمدنی میں کافی اضافہ ہو گیا۔

بوڑھی مصرانی بیٹے کی سعادتمندی اور قابلیت پر پھولی نہ سماتی تھی۔ اسکی زبردست خواہش تھی کہ بیٹا کا بیاہ کر کے اپنا گھر آباد کرے۔ لہذا اُس نے من کوٹ کے ایک اچھے کھاتے پیتے برہمن کی حسین لڑکی کے ساتھ اس کی سگائی کر دی۔ لیکن جب لڑکی والوں نے شگن بھیجا تو رسیلے نے شگن لینے سے صاف انکار کر دیا۔ مصرانی نے بیٹے کو بہت سمجھایا اور منت سماجت بھی کی مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔

بوڑھی مصرانی اپنے فرمانبردار بیٹے کی جسارت اور گستاخی سے بہت آزردہ ہوئی۔ اور روتی ہوئی میرے پاس آئی تاکہ میں رسیلے کو سمجھا بجھا کر شادی پر مجبور کر دوں۔ چنانچہ میں نے رسیلے کو بلا کر پہلے تو ماں کا دل دکھانے پر ملامت کی۔ اور پھر پدرانہ شفقت سے اسے شادی پر آمادہ کرنا چاہا۔ لیکن میں بھی کوشش میں ناکام ہوا۔

اس نے کہا "مالک یوں تو آپ کو مجھ پر ہر طرح کا حق حاصل ہے لیکن شادی کے معاملے میں آپ دخل نہ دیں۔ ورنہ میں کہیں بھاگ جاؤں گا۔ کیونکہ میں عورت ذات سے سخت نفرت کرتا ہوں" میں نے حیرت سے پوچھا "اسکی وجہ" اس نے جواب دیا "کہ میری مرضی" میں لاجواب ہو گیا۔

رسیلے کی اس ہٹ دھرمی سے اس کے متعلق گاؤں میں منافرت کی لہر دوڑ گئی

گاؤں کی لڑکیاں اسے ذلیل و حقیر تصور کرنے لگیں۔ لوگ اپنے لڑکوں کو اس کے میل جول پر ٹوکنے لگے۔ تاکہ وہ اپنے زہریلے خیالات کہیں ان کے دماغوں میں نہ بھر دے۔

رادھا کو بھی اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ اس نے اسی بہانے سے رسیلے کو جی بھر کے کوسا۔ بہت بے عزت کیا اور آخر انتہائی نفرت سے اُس کے منہ پر تھوک بھی دیا۔ غرضکہ رسیلے نے زمانہ کی بدسلوکیوں کو نہایت حوصلے سے برداشت کیا اور اپنے ارادے سے بھی باز نہ آیا۔ بڑھی مصرانی کو بیٹے کی اس ضد سے بہت صدمہ ہوا اور اسی سال وہ بہو کی آرزو دل میں لئے سرگباش ہو گئی۔

ماں کے مرنے کے بعد رسیلا بالکل خودمختار اور آزاد تھا۔ وقت کی رفتار کے ساتھ آہستہ آہستہ گاؤں والوں کا دل بھی اس سے صاف ہوتا گیا۔ لوگ اُسے سنت رسیلا کہنے لگے۔ اور اسی حالت میں اُس نے زندگی کی پچیس منزلیں طے کر لیں۔

اس بات کو چالیس سال کا عرصہ گزر چکا۔ یہی موسم تھا کہ اس علاقے پر پلیگ کا زبردست حملہ ہوا۔ گاؤں کے گاؤں تباہ و برباد ہو گئے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ گھر کے تمام افراد ایک دم مر گئے۔ ان کے مردے گھروں کے اندر ہی سڑتے رہے اور چوہے درندوں کی طرح ان کو کھاتے بھی رہے۔ بعض اوقات یہ مردہ خور چوہے بھیڑ بکریوں کی طرح غول در غول گلی کوچوں میں پھرتے دکھائی دیتے۔

اُن دنوں اکثر ایسی بعید از قیاس اور بے تکی باتیں ظہور پذیر ہوئیں کہ بہت سے آدمی تو دہشت ہی سے مر جاتے۔ آخرکار خلقت نے بدحواسی سے گھر چھوڑ کر باہر صحرا میں چھپر ڈال لئے۔ ہم لوگ بھی یہ حویلی چھوڑ کر باہر کچی حویلی میں چلے گئے جو سامنے والے باغ میں بنی ہوئی تھی۔ لیکن یہاں آتے ہی رادھا پلیگ میں مبتلا ہو گئی۔

رادھا چونکہ واحد اولاد ہونیکی وجہ سے میرے اندھیرے گھر کا چراغ تھی۔ سینہ کا سرور اور آنکھوں کا نور تھی اس لیے اسکی بیماری کوئی معمولی بات نہ تھی۔ سارا کنبہ تیمارداری میں مصروف ہوگیا۔ اس موقع پر وسیلے نے اس کی اتنی خدمت کی کہ اگر کوئی حقیقی بھائی ہوتا تو وہ بھی شاید نہ کرسکتا۔ وہ دن رات برابر اس کی پٹی سے لگا بیٹھا رہتا۔ اس کی صورت سے وحشت برستی تھی اس کی حالت دیکھ کر مجھے اندیشہ ہونے لگا مبادا بیمار نہ ہوجائے۔

جبر ایک ایک لمحہ گنتے ہوئے رادھا کی بیماری کو چھ دن گزر گئے۔ اور ہمیں اسکی زندگی کی کچھ آس بندھ گئی (کیونکہ عام طور پر یہ مرض آناً فاناً اپنا کام کرتا ہے۔ اور جو مریض کچھ ٹک جائے۔ وہ یقینی طور پر بچ جاتا ہے) لیکن جونہی ساتویں رات آئی تو رادھا نے پھر درد و کرب سے تڑپنا شروع کیا۔ یعنی اس کی دوسری بغل میں ایک اور گلٹی نمودار ہوگئی جس سے اس کی حالت دم بدم بگڑنے لگی۔

رادھا کو دم توڑتے دیکھ کر گھر بھر کے چہروں پر مردنی چھا گئی۔ میں فرط غم سے نڈھال ہوکر گھر سے باہر نکل گیا۔ باغ کے شمالی دامن میں ایک گھنے کنج کے درمیان ہمارے بزرگوں کے وقت کا ایک پرانا مندر تھا جس میں کرشن بھگوان کی بڑی سی مورتی نصب تھی۔ انسان چاہے کتنا ہی پاپی ہو مصیبت کے وقت ضرور پرماتما کا سہارا لیتا ہے۔ اسی کے چرنوں میں اسے تسکین اور شانتی نصیب ہوتی ہے۔ لہٰذا میری بھی یہی حالت تھی۔ میں نے بے اختیار مندر کا رخ کیا۔

چودھویں کا چاند آسمان پر جگمگا رہا تھا جس کی تیز روشنی میں صحرا کے ذرات اس آب و تاب سے چمک رہے تھے گویا ہر ذرہ بذات خود ایک چاند تھا لیکن نصف شب کی بہکی بہکی ہواؤں کی فراقیہ گدگدی سے کائنات میں بجائے رنگینی کے ایک اداسی اور رقت چھا رہی

تھی۔ صحن باغ میں چاندنی سے منور زمین پہ درختوں کے سائے اس طرح متحرک تھے۔ جیسے پلیگ کے ہاتھوں بے موت مرے ہوئے انسانوں کی روحیں عالم ارواح سے اتر کر اپنے مردہ بدن کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہوں۔ غرضکہ اس سنسان اور ہو کے عالم میں۔ میں بھی پاپی روح کی طرح فکر و آلام کو پیچھے چھوڑتا ہوا مندر تک جا پہنچا۔

مندر کی پر ہول اور گہری خاموشی میں حقیقی مسرت برس رہی تھی میرے دل میں روحانیت کا چشمہ ابلنے لگا۔ میں نہایت جوش عقیدت سے مورتی کے سامنے جھک گیا۔ اور نہایت عاجزی سے رادھا کی سلامتی کیلئے پراتھنا کرنے لگا۔ درحقیقت من کی صفائی اور آتما کی شانتی کے لیے پراتھنا سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔

اس طرح جب میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو میں مورتی کی پشت کی جانب ایک کونے میں سمادھی لگا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بڑے زور سے مندر کا دروازہ کھلا۔ اور ایک شخص والہانہ جوش سے اندر داخل ہوا۔

آنیوالا بسیلا تھا جو اندر آتے ہی مورتی کے چرنوں میں گر گیا اور گڑگڑا کر بھگوان سے کہنے لگا۔ "ہے بھگوان میری رادھا کو پلیگ کے خونخوار پنجے سے بچا لے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے اور ذلیل سمجھتی ہے مگر میرا دل اس پر مائل ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں وہ میرے من کی رانی ہے۔ آہ میری بڈھی ماں میری شادی کی آرزو دل میں لئے ہی دنیا سے رخصت ہو گئی لیکن میں اس کی آرزو پوری نہ کر سکا کیونکہ میں نے اپنی زندگی رادھا کی خدمت کیلئے وقف کر دی تھی۔ آہ آج ظالم پلیگ میری محبت کا وہ خزانہ مجھ سے چھیننے کے درپے ہے جس کی حفاظت پر میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ آہ آج وہی رادھا جس کا میں پجاری ہوں میرے سامنے دم توڑ رہی ہے بھگوان اگر وہ مر گئی تو میں بھی زندہ نہ رہونگا" کثرت گریہ سے اس کی آواز رک گئی۔

اس انوکھے انکشاف پر میں ششدر رہ گیا۔ مگر مصلحتاً گونگے میں دبکا رہا۔ کچھ وقفہ کے بعد اس نے پھر سر اُٹھایا۔ اور کہنے لگا "آہ بھگوان تم تو بالکل خاموش ہو۔ اگر خود میری مدد نہیں کر سکتے تو مجھے ہی موقع دو۔ تاکہ میں پلیگ سے زور آزمائی کر کے اُسے شکست دوں۔ اور اس کے پنجے توڑ کر رادھا کو بچا لوں۔

عین اُسی وقت باہر سے ایک نہایت مکروہ اور کرخت آواز سنائی دی "پجاری اگر مجھے مندر میں داخل ہونے پر قدرت حاصل ہوتی۔ تو تمھیں شیخیاں بگھارنے کا مزہ چکھا دیتی۔ ہاں اتنے بہادر ہو تو باہر آ کر ذرا اپنی طاقت دکھاؤ"۔ آواز سنکر میرا دل دہل گیا۔ مگر رسیلا جس کی رگوں میں جوانمردی کا خون پورے جوش سے رقص کر رہا تھا۔ بجلی کی سی سرعت سے تڑپ کر اٹھا۔ اور شیر نر کی طرح دروازے سے باہر کود گیا۔

یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔ میں اُسے پکڑنے کے لیے اُٹھا تو سہی۔ مگر دروازہ پر پہونچکر میرے پاؤں خود بخود رک گئے۔ باہر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور حواس باختہ وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اتنے میں کہیں دور سے مرغ سحر کی دھیمی سی (ککڑوں کوں) کی صدا خاموشیوں کو چیرتی ہوئی فضا میں گھل مل گئی۔

میں پیغام صبح سنکر ایکدم چونکا۔ اور حوصلہ کر کے باہر نکلا۔ باہر بدستور وحشت برس رہی تھی خشک چاندنی شبنمی ہواؤں سے قدرے نرم پڑ چکی تھی۔ لیلائے شب کے منتشر سیاہ گیسو بتدریج سنورتے اور سمٹتے جا رہے تھے۔ میں ادھر ادھر رسیلے کو تلاش کرنے لگا۔

یکایک مویشی خانہ کی طرف سے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز نہایت بھیانک اور اُلّو کی چیخوں کی مانند تھی۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا ادھر گیا۔ لیکن مویشی خانہ کے سامنے پہنچکر مجھے رکنا پڑا۔ کیونکہ کوئی شخص چیختا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ جسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے

ہو گئے۔ اور میں سہم کر درخت کی اوٹ میں چھپ گیا۔ آنے والی ایک نہایت میلی کچیلی اور بے حد کریہہ المنظر بڑھیا تھی جس نے اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر لٹکا رکھے تھے۔ گویا ٹوٹے ہوئے ہوں۔ وہ چیختی چلاتی اور بے تحاشا بھاگتی ہوئی میرے قریب سے گزر گئی۔

اس کے دور چلے جانے پر میں چھپر کی طرف بڑھا۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر رسیلا چھپر کی منڈیر کے سہارے نیم دراز تھا۔ اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کس کر چھاتی سے لگا رکھی تھیں۔ میں نے اسے پکارا مگر اس نے جواب نہ دیا۔

اس کی بے ہوشی سے آگاہ ہو کر میں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اس کی کنپٹیاں سہلائیں اور آہستہ آہستہ اس کی کسی ہوئی مٹھیوں کو کھولا۔ تو کوئی چیز اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر بکھر گئی۔ میں نے تعجب سے اس چیز کو جھک کر دیکھا۔ آف اس ہولناک اور ناپاک چیز کو دیکھ کر میرا رواں رواں کانپ گیا۔ خدا معاف کرے وہ تو دس لمبے لمبے ناخن تھے جو کسی درندے کے پنجوں سے تازہ چھڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ دہشت اور کراہت سے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرا بدن پسینے میں تر ہو گیا۔

کافی وقفہ کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں۔ رسیلا ابھی تک بدستور بے حس و حرکت پڑا تھا۔ کیونکہ وہ دوسری دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ صبح صادق کی پر عظمت دھیمی روشنی اور چاندنی کے ڈھلتے سایوں میں ہوائیں موت کا راگ گاتی ہوئی ہچکیاں لے لے کر چل رہی تھیں۔ پردیس کا کنواں نہایت حسرت ناک لے میں (دت نہیں آوناں دیس پیارے کھنڈن دے دن چار) کی راگنی گاتا ہوا اس کی جوانمرگی پر آنسو بہا رہا تھا۔ مگر اسکی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے فتح اور کامیابی جھلک رہی تھی۔ کیونکہ وہ بازی جیت چکا تھا۔

رسیلے کی موت کے بعد رادھا کی حالت روز بروز سنبھلتی گئی یعنی رسیلے

نے پلیگ کے پنجے توڑ کر اسے بچالیا بلکہ بستی میں بھی بہت جلد امن قائم ہوگیا۔ اور پھر اس دن کے بعد کبھی اس گاؤں میں پلیگ نہیں پھوٹی چنانچہ اس پرحسرت واقعہ کی یاد میں اس گاؤں کا نام ٹکر پڑ گیا۔ پرانے زمانے کے لوگ اسے رسیلے کی نگری بھی کہتے ہیں ورنہ کسی زمانہ میں یہ گاؤں من کوٹ کا ہی ایک حصہ تھا جو نیا من کوٹ کہلاتا تھا۔

۶

رسیلے کے صبرو استقلال۔ پاکیزہ عشق اور بہادری کی اندکھی داستان سنکر میں نقش حیرت بن گیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ آخری راتوں کا کمزور چاند۔ گرد و نواح میں اپنی روکھی پھیکی چاندنی پھیلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یک بخت ہوا کا ایک آوارہ جھونکا سوکھے پتوں کی جھانجھ بجاتا ہوا اٹھا۔ اور بلند ہو کر کھجوروں کی درازچوٹیوں سے ٹکرایا۔ تو کھجوروں کی سخت اور نوکیلی شاخوں نے زبانِ بے زبانی سے (دنٹ آوناں دیس پیارے کھیڈن دے دن چار) کا غمگین ترانہ الاپنا شروع کیا۔ تمام صحرا میں ایک پر درد گونج پیدا ہوگئی عین اسی وقت کسی صحرا نشین نے بھی یہی راگنی چھیڑ دی۔

چاروں طرف سے پیغام فنا سنکر دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ آزردہ حالی سے میرا دماغ معطل ہوگیا۔ حتیٰ کہ میں نیند کی وادی میں داخل ہو کر ایک لاہوتی دنیا میں کھو گیا۔

نئی مصیبتیں

ڈاکٹر رشید جہاں

ڈاکٹر رشید جہاں

میرے حالات کیا ہیں؟ میرے والد شیخ عبداللہ ہیں۔ اور والدہ کا نام وحید جہاں بیگم تھا۔ جو عبداللہ بیگم کہلاتی تھیں۔ میرے اوپر صرف ادب ہی کا اثر نہیں پڑا ہے، بلکہ ہندوستان کے ماحول کا، عورتوں کے حقوق کے سوالوں کا، ہندوستان کی آزادی کا، دیگر مذہبوں کا اور سب سے زیادہ انسانوں کو جاننے اور اُن سے ملنے تبادلۂ خیالات کرنے اور اُن کے حالات کا مطالعہ کرنے کا پڑا ہے، میں نے گرلز مسلم کالج علی گڑھ میں میٹرک کی تعلیم پائی ہے اور اس زمانے میں اپنے ماں اور باپ کا مجھ پر بہت اثر پڑا ہے۔ رسماً نہیں بلکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ ان دونوں نے کس جوش اور خلوص سے اس کالج کو بنایا ہے۔ اور یہاں صرف امیر اور درمیانہ طبقہ کی لڑکیاں ہی نہیں پڑھتیں بلکہ غریب بھی۔ ہمارے اسکول میں ایک بات ہے جو میں نے کہیں بھی نہیں دیکھی۔ جو لڑکی فیس دے یا وظیفہ سے پڑھے ایک دفعہ اسکول میں ہو تو اس میں کوئی جمع تفریق نہیں کی جاتی سب کو ایک ہی کھانا ملتا تھا۔ ایک سا سلوک ہوتا تھا۔ اس زمانے میں میں نے اُردو میں کئی مذہبی پیشواؤں کی زندگی کے حالات پڑھے۔ اسکول میں کافی نیشنل خیال رکھنے لگی تھی۔ نذر سجاد حیدر صاحبہ، منشی پریم چند اور ہنری ووڈ مجھ کو بہت پسند ہیں۔

پھر ازبیلا تھوبرن کالج لکھنؤ میں ایف. سی. گیا. اور یہاں پہلی مرتبہ مذہبوں کو عقل کی ترازو سے ناپ تول کرنے کا اتفاق ہوا. اور سخت تعجب ہوا کہ جس بات کیلئے ایک مذہب یا مذہب والے دوسرے کو بُرا کہتے ہیں وہ خود بعض ان میں موجود ہیں سوشل سرکس جن کی گود میں پلی بڑھی تھی اور کوئی اجنبی چیز نہ تھی، یہاں آکر سمجھ میں آنے لگی. اس زمانہ میں میں نے پہلا افسانہ انگریزی میں لکھا تھا جو کالج میگزین میں چھپا. اور کبھی کئی چیزیں لکھیں چند کالج میگزین میں چھپیں اور باقی نہیں۔ اس زمانے میں میں نے کالج لائبریری سے کافی فائدہ اٹھایا. اور مجھ کو اب خیال آتا ہے کہ ڈکنس. ٹیگور، جین آسٹن مجھے بہت پسند تھے اور جی چاہتا تھا. کہ جین آسٹن کی طرح لکھنے لگوں. مجھ کو اب بھی جین آسٹن بہت پسند ہے. یہاں میرے نیشنل خیالات ویسے ہی رہے. جیسے کہ اسکول میں بس ہندوستان آزاد ہو اور گاندھی جی کی میں زبردست چیلی تھی۔

پھر میں لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج میں گئی اور ڈاکٹری پاس کی. اور غالباً میری آئندہ کی زندگی اسی ڈاکٹری کی وجہ سے آج ایسی ہے. میری طبیعت میں کھوج ہمیشہ سے ہے اور اس سائنس نے جستجو کو اور بڑھا دیا. زیادہ لوگوں سے ملنے، زیادہ گھروں میں جانے، غربت سے دوچار ہونے کا موقع ملا. کالج کی انگریز استانیاں اتنی خردماغ تھیں کہ خدا کی پناہ. لیڈی ہارڈنگ کا ماحول مجھکو سخت ناپسند تھا. کیونکہ وہ کالج ایسا لگنے لگتا تھا کہ ہندوستان میں ہے ہی نہیں. اس زمانے میں میں نے ڈرامے پڑھے اور کالج کیلئے لکھے بھی اور ایکٹنگ بھی کافی کی. میں نے اس کالج میں ڈرامے انگریزی اور اردو دونوں میں لکھے. تھوڑے سے ڈرامے پڑھے Betty کے مجھ کو

پسند تھے، ہمارے کالج میں ادبی لائبریری نہ تھی۔ کچھ افسانے مردانہ نام رکھ کر چھپوائے مجھکو یہ بالکل نہیں معلوم تھا کہ میں کبھی لکھ بھی سکونگی۔ لہٰذا میں نے کوئی چیز کالج کی جمع کر کے نہیں رکھی۔

۱۹۳۲ء میں پہلی بار سمجھ میں آیا کہ ہندوستان کے لئے کمیونزم ہی ایک نجات کا راستہ ہے اور اسی سال سجاد ظہیر سے میری ملاقات ہوئی۔ ۱۹۳۳ء میں "انگارے" میں انھوں نے میرے دو مضامین چھاپے اور پہلی مرتبہ میرے اپنے نام سے یہ چیزیں چھپی تھیں اس زمانے میں میں نے منشی پریم چند کو بہت پڑھا اور ٹولسٹائی کو اور ایلیس ہولک کو۔ میرا سب سے زیادہ پسندیدہ مصنف برنارڈ شا رہا ہے۔ کیونکہ مجھ کو ڈرامہ نگاری سے بہت شوق ہے بہ نسبت افسانہ نگاری کے۔ میں پچھلے دس سال میں جب سے میں نے پردہ چھوڑا ہے ہندوستان کے کئی بڑے ادیبوں سے مل چکی ہوں اور سیاسی رہنماؤں سے بھی اور اب میں اپنے افسانوں میں یہی کوشش کرتی ہوں کہ جو میرے خیال میں ان کی ترجمانی ایمانداری کے ساتھ کروں۔ میرا ایک مجموعہ "عورت" چھپا ہے اور "نیا ادب" اور "ادب لطیف" میں اکثر میرے افسانے اور ڈرامے نکلے ہیں۔

یہ افسانہ مجھ کو کیوں پسند ہے؟ معلوم نہیں! ایک ماں کو سب بچے یکساں نہیں پیارے ہوتے۔ اسی طرح ایک مصنف کو بعض چیزیں اچھی لگتی ہیں۔

"لو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ یہ اون کیا بھاؤ ملا تھا؟" اماں نے بھابی صغرا سے پوچھا۔ جو میری چچازاد بھاوج تھیں اور دو سال ہوئے بیوہ ہو گئی تھیں۔

"شاید بارہ روپے پونڈ تھا۔ کیوں نہ اماجان؟ وہ ساس کے لئے اون کھول کر گولے بنا رہی تھیں۔"

"اُف اون اس سال کتنے مہنگے ہو گئے ہیں۔" صغرا کی جٹھانی عطیہ بولیں۔ "بچوں کے سب جمپر اونچے ہو گئے۔ اب مسز رابرٹ کو اون لا کر دیا ہے کہ ان کے سوئٹر بن دے۔ بڑی مشکل ہے۔"

"آپ کو کیا مشکل بنے گی تو بیچاری نرس ــــ" مجھ میں اور بھابی عطیہ میں بالکل نند بھاوجوں کے تعلقات تھے۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں اور برائیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اور موقع پر بغیر چوٹ کئے نہ رہتے تھے۔ بھابی عطیہ کی زندگی میں علاوہ

تین بچے پیدا کرنے کے ایک کام اور بھی تھا کہ وہ سال میں دو تین جمپر یا پل اُوور بن لیں اور پھر اس کا چرچا کریں۔

"کیوں کیا میں نہیں بنتی؟" بھابی عطیہ نے چٹخ کر کہا۔ میں جواب دینے کو تھی ہی کہ اماں نے میری طرف گھورا اور زور زور سے باتیں کرنے لگیں تاکہ مجھ کو جواب کا موقع ہی نہ ملے۔ اور بقول صغرا کے میری اور بھابی عطیہ کی شائستہ لڑائی نہ ہو۔ اماں کو صغرا نے بھی مدد دی اور کہنے لگیں "سچ تو ہے اُون بہت مہنگا ہو گیا ہے اور اس سے پہلے کہ اور مہنگا ہو میں بھی اپنے لئے ایک جمپر کا لے آؤں گی۔"

میری چچی اماں یعنی صغرا کی ساس آتش دان کے سامنے اپنی سفید بلّی کو گود میں لیے بیٹھی تھیں۔ ادھر بلی اونگھ رہی تھی اُدھر چچی اماں، لیکن نہ معلوم کس طرح صغرا کی بات سنکر اسی طرح آنکھیں بند کئے کئے بولیں "لاؤ گی کہاں سے؟ آجکل لڑائی کے زمانے میں اُون رہا ہی کہاں ہے جو لے آؤ گی!"

"کیوں ابھی صبح ہی تو آپ دُکان سے لے کر آئی ہیں اور اب کیا دن بھر میں ساری دُکانیں خالی ہو گئیں" چچا جان بیوی کی بات کو بغیر ٹوکے نہ جانے دیتے تھے۔

"چچی اماں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔

"میں نے کب کہا تھا کہ دُکانیں خالی ہو گئیں"

"تو پھر آپ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں؟" چچا جان نے کافی بگڑ کر کہا یہ کوئی نیا قصّہ نہ تھا۔

جب صغرا سہاگن تھیں تب ساس کی دست نگر تھیں اور اب تو اور بھی زیادہ ان کے اوپر روپیہ کا خرچ ہونا چچی اماں کو ہمیشہ سے ناگوار گزرتا تھا۔ اور صغرا چچا جان کی آنکھ

کاتار اتھیں۔ بیٹے کی موت کے بعد تو وہ ان کو بالکل ہاتھوں پر رکھتے تھے۔

"تو کیا میں جھوٹ کہتی ہوں۔ اون کیا اب کوئی خریدنے کی چیز رہ گئی ہے!"

"تو پھر آپ نے کیوں خریدا؟ .... صغرا کل چلنا میرے ساتھ اور جو پسند آئے لے آنا........"

"اے ہے ابا جان رہنے بھی دیجئے میں نے تو یوں ہی کہہ دیا تھا۔ اماں جان ٹھیک تو کہہ رہی ہیں لڑائی کا زمانہ ہے ہر چیز مہنگی ہے۔"

چچا جان بڑبڑاتے ہوئے کھانے کے لئے تیار ہونے چلے گئے۔ بس اتنا سمجھ میں آیا "خیر تم مت لینا مجھ کو تو اون چاہئے...... میں ضرور خریدونگا......"

"میری تو ہر بات کو اب یہ الٹ دیتے ہیں......... لو میں نے کیا غلط کہا تھا کہ اون اب ناپید ہو گیا ہے۔" چچی اماں نے شکایت بھرے لہجے میں کہا کہ سننے والے کو ترس آجائے۔ آج ہی صبح میں، بھابی عطیہ، اماں جان، چچی اماں سب مل کر سو روپئے سے زیادہ کا اون لے کر آئے تھے۔

"اون ہی پر کیا ہے۔ ہر چیز اسی طرح اُجڑ گئی ہے" میری اماں نے بات کو رفع دفع کرنے کو کہا۔

"جی ہاں، چچی جان ٹھیک ہے۔ اب جارجٹ کے دام ہی دیکھ لیجئے پچھلے سال میں نے ساڑھے تین روپیہ گز بہت اچھی جارجٹ لی تھی۔ وہ اب پانچ روپیہ گز بھی نصیب نہیں۔ اب اس دفعہ میں نے اتنے تھوڑے کپڑے مسوری میں بنائے، اب پہننے تک کو بھی نہیں ہیں۔"

کم از کم آٹھ ساریاں تو تم نے ہمارے ہی سامنے خریدی ہونگی۔ اور کوٹ...."

میں بیچ ہی میں بولی۔

"وہ بھی کوئی ساریاں تھیں۔ ذرا تم اپنی الماری تو ملاحظہ فرماؤ۔"

نوکروں کی وردیاں ہر سال سوسوا سو میں بنجاتی تھیں۔ ان کو تو عادت ہے اندھا دھند اُٹھانے کی۔ نوکروں کا ستیا ناس کر دیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس سال رہنے دو۔ ابھی تو اچھی خاصی ہیں تو بگڑ گئے کہ میں نوکروں کو گندا نہیں رکھ سکتا۔ کبھی جو کوئی بات سُن لیں۔"

چچی اماں نے پھر شکایت کی۔

"ارے ہے یہ تو ان سب بھائیوں میں عیب ہے کہ صفائی کے نام پر ہزاروں روپیہ خرچ کر دیتے ہیں۔" اماں نے کہا۔

"ہاں بھلا بی بی آج کل یہ خرچ کہاں چل سکتے ہیں۔ اب گھر میں ایک آدمی ایسا تو ہو سب کیوں ایسے ہو جائیں۔" یہ چوٹ بچاری صغرا پر ساس نے کی ....

ہماری چچی بس اپنے اوپر خرچ کرنا فضول خرچی نہ سمجھتی تھیں ساٹھ برس کی عمر ہونے پہ بھی بہت شوقین تھیں اور باوجود بے شمار ساریاں ہونے کے صبح ہی دو نئی ساریاں خریدی تھیں۔ مجھ سے چھیڑے بغیر نہ رہا گیا میں نے کہا۔

"چچی اماں آپ جو نئی ساریاں لائی ہیں وہ کتنے کی ہیں؟"

چچی اماں جن کو ابھی تک چچا جان پر غصہ آرہا تھا کچھ نہ سمجھیں اور بہت سنجیدگی سے کہنے لگیں۔ "کیا بتاؤں بیٹی کریپ ڈیشین کی قیمت نو روپیہ گز زیادہ ہو گئی۔ ۲۷ روپیہ میں وہ ساری ملی۔ لو بھلا اب کوئی کیا کپڑا پہن سکتا ہے اور دوسری تو خیر سودیشی سلک تھا۔ ۱۷ روپیہ میں سستی ہی مل گئی۔ میں کہتی ہوں کہ آج کل تو بُرا زمانہ

آگیا ہے کہ نہ کھانے کا ٹھیک رہا ہے اور نہ پہننے کا بڑی مصیبت کے دن ہیں .....

...... اور ابھی تو دیکھو کیا کیا ہونے والا ہے ....“

آپ سچ کہتی ہیں اماں جان“ بھابی عطیہ نے ٹھنڈا سانس لیکر دل دکھا دینے والی آواز میں کہا“ یہ موئی لڑائی نہ معلوم کیسی ہے کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتی۔ میرا تو سارا آرام وچین اس کمبخت کی نذر ہو گیا ہے .....“

صغرا میری طرف دیکھ کر مسکرائیں اور پھر منہ دوسری طرف کر لیا —“

کسی چیز کا بھی ٹھیک ہو......... پٹرول کے دام ہیں کہ باوا کے مول اور پھر بھی ناپید، وہ تو کہو کہ تمھارے بھائی جان کے پاس ٹوٹی ہوئی پرانی شکار کی موٹر پڑی تھی۔ اس چھکڑے کو پچاس روپیہ دے کر رجسٹرڈ کروایا تو کہیں جا کر دو موٹروں کا تیل چوبیس گیلن نصیب ہوا۔ سچ مچ اس لڑائی میں تو پچھلی لڑائی سے بھی زیادہ تکلیف اور مصیبت ہے“ چچی اماں قریب قریب رو دیں۔

”ہم نے تو اپنی موٹر بند ہی کر دی ہے۔ مجھ کو تو روز صبح سویرے سیر کرنے کی عادت برسوں سے ہے۔ میری صحت تو جب سے پٹرول کی قلت ہوئی ہے ناس ہو گئی۔“ میری اماں نے صاد کی۔

”ہاں یہی تو میں بھی کہتی ہوں کہ یہ پٹرول پر پابندی سرکار نے کیوں لگا دی اب دام دو روپیہ چار آنہ گیلن ہے چاہے تین روپیہ کر دیتی۔ لیکن یہ بارہ اور چودہ گیلن کی قید نہ لگتی جس کے پاس دام ہوتے نہ خریدتا جس کے پاس نہ ہوتے وہ نہ خریدتا“ بھابی عطیہ نے اس طرح جل کر کہا کہ جیسے گورنمنٹ کو خاص ان سے دشمنی ہے۔

پٹرول پر ہی کیا ہے اس لڑائی کی وجہ سے تو ہر چیز پہ آفت آئی ہوئی ہے

لو بھلا سیب پونے دو روپے سیر ہیں۔ کیا سیب بھی یہ نگوڑے سپاہی کھا جاتے ہیں؟" میری اماں نے بہت ہی جلی بھنی آواز میں پوچھا۔

"اور انڈے"، پھوچی اماں نے کہا "بارہ آنے درجن تو ہو گئے اور مرغی وہ بھی اب دو روپیہ پاک ہو گئی۔ کوئی کھائے تو کیا کھائے اور تو اور آج تمھارے سامنے ساری دکانیں دیکھ لیں۔ پرونس Prunes کہیں ملتے ہی نہیں، بلا سے پچھلے مہینے میں بیس روپیہ میں سات سیر کا ٹین مل تو گیا تھا۔ اب وہ بھی نہیں...... فروٹ سیلڈ بغیر پرونس کے بچے تو چھکتے بھی نہیں........"

"جی ہاں گھر والوں کی بڑی مصیبت ہے" عطیہ نے ساس کے ساتھ ہمدردی کی "راشد تو برابر یہی کہتا آتا ہے کہ دادی اماں کا خانساماں بہت ہی اچھے چیز اسٹیکس Cheese Staks بناتا ہے۔ ہمارے خانساماں سے بھی اچھے......"

اے لو تو میں کیا کروں دلہن کُکنگ چیز Cooking Cheese تو ایسا غائب ہوا ہے کہ اب دکھائی ہی نہیں دیتا۔ میں اسلم کی دوکان پر خود گئی اور کہا کہ بھئی سونے ہی کے مول ذرا سا دیدے۔ ہمارے بچے کا دل بہت چاہ رہا ہے لیکن وہ کہیں ہو تو ملے۔"

"ایک تکلیف ہو تو ذکر کیا جائے۔" اماں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"اے ہے یہ ساری آگ ایک دم کہاں غائب ہو گئی؟" بھابی عطیہ نے سُو سُو کرکے ایکدم سے کہا۔

"لے سچ تو ہے اس کمبخت واحد نے نہ تو لکڑی پوری ڈالی اور نہ ہیٹر اب تک لگایا۔ ارجمند ذرا اس گھنٹی کا بٹن تو دبانا........ چار چار تو ہیٹر ہیں اور

پھر بھی بیٹھے سردی میں سکڑا کرو۔ بوا آج کل تو کوئلہ بھی دو آنہ سے دو روپیہ ہو گیا۔ بجلی ہی سستی نہیں ہے۔ اے لو وہ تو کوئی جواب ہی نہیں دیتا۔"

پھر صغرا سے کہا۔ "ذرا صغرا تم جانا دیکھو تو یہ سب لوگ کہاں غائب ہو گئے تمہاری جٹھانی کو سردی لگ رہی ہے"۔......... صغرا ان کو چھوڑ کر جلدی سے اُٹھیں اور ساتھ ہی میں بھی "بھابی ٹھہرو میں بھی آتی ہوں" کہہ کر ان کے پیچھے بھاگی۔

"دیکھو گرم کمرے میں......... جانا۔ ٹھنڈ میں نہ جانا"۔ اماں کی آواز میرے کان میں آتی ہی رہی کہ میں اور بھابی برآمدے میں ہو کر باہر آ گئے۔ باہر ہوا اتنی تیز اور ٹھنڈی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ جسم کے آر پار ہو رہی ہے۔ بھابی نے باہر نکل کر واجد! واجد! کہہ کر آواز دی اور کوئی جواب نہ پا کر بولیں "بیچارہ سردی کے مارے پلنگ میں گھس گیا ہو گا۔ جانتا ہے کہ کھانے میں ابھی آدھا گھنٹہ ہے"۔ وہ شاگرد پیشہ کی طرف بڑھیں۔ تھوڑی دور چل کر نیم کے درخت کے نیچے ایک الاؤ نظر آیا اور ہم شاگرد پیشہ میں جب داخل ہوئے۔ تو وہاں پنچایت جڑی ہوئی تھی۔ مالن مع اپنے تین چار بچوں کے بیٹھی تھی۔ دھوبن بھی مع اپنی نوج کے جمی ہوئی تھی۔ واجد اور دوسرے خدمت گار بھی وہاں موجود تھے مہتر بھی ایک کونے میں بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی دھوبن چیخی "اے چھوٹی دلہن ذرا ادھر آنا"۔

چھوٹی دلہن ذرا جھک کر آگ تاپنے لگیں۔ سب مرد نوکر کھڑے ہو گئے۔

"کیوں کیا ہے؟" صغرا نے پوچھا۔

"اے دلہن! یہ لڑائی کب تک چلے گی؟"

"بہت دن .... کیوں؟"

"ہے رام .... سچی؟"

"ہاں ہاں سچ ہے۔ ابھی بہت دن چلے گی" صغرا نے لاپروائی سے کہا۔

"تو ہم لوگ کیسے جیئیں گے؟"

"پرسوں تک تو آٹا چھ سیر کا تھا آج تین سیر کا ہے"

"اے بٹیا سچ بتاؤ۔ یہ مہنگا کب ختم ہوگی؟ ہمرا اور ہمرے بچن کا پیٹ کیسے بھرے گا؟" السن میری طرف مخاطب ہوئی۔

"چنا بھی تو آٹھ سیر کا ہے"

"دلہن تم تو ہر بات میں مجاخ کرتی ہو۔ سچی بتاؤ اکھبار میں کا لکھا ہے؟" دھوبن نے بھابی کی طرف بہت سنجیدگی سے دیکھا۔

"ارے بھئی کہہ تو رہی ہوں۔ میرا یقین نہیں تو ان سے پوچھ لو" سب نے امید بھری نظریں میری طرف پھیریں۔ جب میں چپ رہی تو دھوبن بولی۔

"دلہن! تمیجا بوا کہت رہیں کہ نوکروں میں چھٹنی ہوگی؟ کا یہ ٹھیک ہے؟"

"مجھے کیا معلوم!"

راجہ ہیٹر لگانے چلا گیا۔ میں اور بھابی وہیں الاؤ پر کھڑے باتیں کرتے رہے۔ جب کھانے کی گھنٹی بجی تو ہم گھر کی طرف چلے۔

راستے میں بھابی نے دیکھا کہ میں کچھ گرم کپڑا نہیں پہنے تھی ——— بولیں

"اوئی ارجمند تم بھی خدا کی قسم ایک چلتی پھرتی آفت ہو۔ بیمار پڑ گئیں تو ایک اور نئی مصیبت آ جائے گی.........."

میں ابھی تک نوکروں کے پریشان چہروں میں کھوئی ہوئی تھی۔ بغیر سوچے سمجھے "اور" پر زور دے کر بولی "یہ اور کی آپ نے خوب کہی۔" بھابی ہنسیں "اور نہیں تو کیا۔ بھابی عطیہ کی جارجٹ مہنگی ہو گئی۔ یہ کم مصیبت ہے۔ تمھاری اماں کی ہواخوری گئی یہ کچھ کم مصیبت ہے۔ اور ہماری ساس بیچاری کی مصیبتوں کا شمار ہی نہیں۔ نہ گلگنگ چینر ہی ملتا ہے اور نہ پروینس.......... اور اگر اس پر تمھیں نمونیا ہو گیا؟"

واپسی

صدیقہ بیگم سیوہاری

صدیقہ بیگم سیوہاروی

سن پیدائش غالباً ۱۹۲۵ء یا اس سے پہلے مقام لکھنؤ، عمر کے دس بارہ سال وہیں گذارے۔ پھر اپنے وطن سیوہارہ ضلع بجنور (یو۔پی) آگئی۔ ناسا عد حالات کی بنا پر اسکول کالج کی تعلیم حاصل نہ کرسکی۔ جو کچھ پڑھا گھر کی چہار دیواری میں "قید" رہ کر، جہاں متوسط طبقہ کی تمام "خصوصیات" موجود تھیں۔ جو کچھ سیکھا وہ کتابوں اخباروں اور رسائل سے، ایک سال کے لئے اپنے پھوپی زاد بھائی کے پاس علی گڈھ چلی گئی۔ یہ میری زندگی کا موڑ تھا۔ یہیں آکر میرے اُن خیالات پر (جن کو اب میں کسی حد تک رجعت پسند سمجھتی ہوں) ضرب کاری لگی۔ وہ تمام ادبی نظریات درہم برہم ہو گئے جن کی بنیاد محض زبان کی رنگینی اور لفظی رعائتوں پر قائم تھی۔ علی گڈھ ہی آکر اشتراکیت کا مطالعہ شروع کردیا اور اپنے لیے صحیح راستہ تلاش کیا۔ بنگال کی "ٹریجڈی" نے میری زندگی پر نمایاں اثر ڈالا جس نے میرے نظریہ زندگی کو یکسر بدل دیا میری کہانی "تصویر" کسی حد تک میری زندگی کی ترجمان ہے جس کا مفہوم بعض ناقدین نے غلط طور پر پیش کیا۔ علی گڈھ میں رشیدہ آپا (ڈاکٹر رشید جہاں) سے ملاقات ہوئی۔ انکی صحبت میں بہت کچھ حاصل کیا۔ محترم سجاد ظہیر، احتشام صاحب، پروفیسر آل احمد سرور،

جناب اختر انصاری نے برابر میری رہنمائی کی جس کی میں ہمیشہ ممنون رہوں گی
علی گڑھ کے زمانہ قیام میں دلی کے ایک زنانہ رسالہ "آوازِ نسواں" کی ایڈیٹر رہی جس کو میں "نیا راگ" کے نام سے نکالتی رہی۔ لیکن یہ خدمت ایک سال سے زیادہ انجام نہ دے سکی۔

فی الحال کچھ عرصہ کے لیے سی۔ پی۔ میں اپنے بھائی کے پاس جو یہاں ریلوے میں ملازم ہیں، مقیم ہوں۔ لیکن یہاں کی فضا بھی سازگار نہیں۔

میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ "ہچکیاں" شائع ہو گیا ہے۔ اور اب ڈراموں کا ایک مجموعہ "ٹوٹے ہوئے گھر" کے نام سے اشاعت گھر حیدرآباد (دکن) سے شائع ہو رہا ہے۔ افسانوں کا دوسرا مجموعہ "پلکوں میں آنسو" زیرِ ترتیب ہے۔

"فریدہ بھنو! ادھر سنو تم سے کام ہے" رشید نے آہستہ سے کہا اور کمرہ کی طرف قدم بڑھائے۔ اس کی بہن بھی کتنی سیدھی ہے۔ اتنی بڑی ہو گئی مگر پھر بھی میرے اوپر جان چھڑکتی ہے۔ وہ سوچنے لگا آڑے وقت پر بس یہی تو کام آتی ہے۔ سچ ہے بہن کی محبت کتنی بے لوث ہوتی ہے۔ جب روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے تو بس میرا آخری سہارا یہی ہے۔ رشید نے مسکراتے ہوئے فریدہ کی طرف دیکھا جو ابھی تک کپڑے سینے میں بدستور مشغول تھی۔ شاید اس نے سُنا نہیں اپنے بیاہ کے کپڑوں سے کتنی دلچسپی لے رہی ہے۔ کیوں نہ ہو اس کے اپنے ہی کپڑے ہیں۔ دو مہینہ بعد اس کی شادی ہو جائے گی مگر پھر تو بڑی مشکل ہو گی۔ مہینہ کے آخری دنوں میں کیا ہو گا۔ آخر یہ پانچ چھ روپیہ کتنے دن چلیں گے۔ اتنے دن سے کہتا ہوں لیکن بوا سے یہ نہیں ہوتا کہ چار روپیہ اور بڑھا دیں۔ وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہر چ [illegible] نگی ہو گئی۔ مہنگائی

کا بھتّہ سب کا بڑھ گیا ہے۔ لیکن ہمارے روپیہ وہیں کے وہیں۔ ایک دھیلا نہیں بڑھتا اور اس پہ بھی طرہ یہ ہے کہ اگر بس چلے تو اس میں سے بھی کٹ جائیں۔ وہ تو کہو ہیں منتظم نہیں دینا۔ ورنہ یہ بڑا بھلا کہیں ایک پیسہ بھی دے دیں۔

"فریدہ؟" اس نے دوبارہ آواز دی۔ "بھئی ذرا سنو کام ہے۔"

"سنتی نہیں بہری ہو گئی —— کتنی دیر سے بھیّا بلا رہا ہے۔"

"آئی بھیّا!" اس نے زور سے کہا۔ بھائی کے تیور ہی دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو آج پھر بھیّا کو روپیہ کی ضرورت ہے۔ اچھی مصیبت ہے۔ آخر روز روز بھی روپیہ کہاں سے آئے۔ پانچ روپیہ جو انھیں ملتے ہیں وہی مجھے بھی۔ آخر مجھے کہاں زیادہ مل جاتا ہے۔ بلکہ اس میں بھی کبھی کبھی کمی ہو جاتی ہے۔ یہ سوچتی ہوئی وہ اٹھی اور سامنے والے کمرہ میں رشید کے پاس چلی گئی۔ "بس سمجھ گئی آج پھر عزت خطرہ میں ہو گی۔ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ ویسے بھی آج بیس تاریخ ہے۔ میرے پاس جو کچھ تھا وہ ——"

"سنتی نہیں اپنی کہے جاتی ہے۔ اس شادی نے تو تیرا دماغ اور خراب کر دیا۔" رشید نے کچھ ہنس کر کہا۔ فریدہ نے سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پہ ایک بناوٹی غصہ آیا۔

"اچھا مجھ سے مذاق تو نہ کیجیے۔ کہیے جو کچھ سنانا چاہتے ہیں۔ مجھے کپڑے سینے ہیں۔ ورنہ پھر ابّا بگڑیں گی۔"

یہ کپڑے بھی میرے لیے اچھی مصیبت ہو گئے۔ جب گھر میں آؤ کپڑے سل رہے ہیں اور وہ بھی معمولی نہیں بڑے قیمتی۔

بس تیرے تو ٹھاٹ ہیں۔ ابّا اگلے ہفتہ میں آ رہے ہیں اور کچھ لا رہے ہوں گے

جارجٹ کی ساریاں، بنارسی دوپٹہ۔ بس تو تو بیاہ کرکے اپنے گھر راج کرے گی ہم ہی ٹھر بیں گے۔"

"اچھا تو آپ نہیں مانیں گے۔ میں کہتی ہوں بوا سے۔ جب دیکھو چھیڑتے رہتے ہیں۔"

"ارے ارے۔ بوا سے نہ کہنا تمھارا غصہ خراب ہے۔ اب جاؤ تمھاری شادی کی بات نہیں کرتے۔ کام کی بات کریں گے۔"

"ہائے اللہ کہو کیا کہہ رہی ہو کیسے کپڑے ـــ" رشیدہ نے پھر چھیڑا۔

"اچھا بھنو شادی وادی کی بات نہیں ہوگی۔ بات یہ ہے کہ در اصل آج بڑا اچھا کھیل آیا ہوا ہے۔ یوں سمجھو کہ اتنی زبردست تعلیمی تصویر کبھی نہیں آئی۔ اب اس کا دیکھنا بھی کتنا ضروری ہے۔ لیکن پیسہ پاس نہیں۔ میرے روپیہ کتابوں میں خرچ ہو گئے اب تم ہی بتاؤ کیا کریں۔"

"تو کتابوں والے روپیہ بوا سے لیجئے نا۔ وہ دیدیں گی۔"

"اجی وہ نہیں دیں گی۔ بیکار ہے کہنا۔"

"ارے کہہ تو دیکھئے۔"

"پھر وہی مرغی کی ایک ٹانگ ـــ اری بھنو کہہ کے دیکھ لیا۔ تبھی تم سے جھک مار رہا ہوں۔ اگر بوا ایسی ہوتیں تو رونا کس بات کا تھا۔"

"تو پھر میں کیا کروں۔ تم ہی بتاؤ کہاں سے لاؤں۔ جتنا تمھیں ملتا ہے اتنا ہی مجھے بھی۔ سوئیٹر میں تھوڑا سا اون کم پڑ گیا تھا وہ میں نے منگا لیا تم ہی بتاؤ کہ پانچ روپیہ کا اون اب لڑائی کے زمانے میں کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔"

دیکھو بھیّو یہ سب ٹھیک ہے مگر اب میں کیا کروں۔ احمد سے غلطی سے کہہ دیا گیا کہ آج تمھیں سینما دکھائیں گے بعد میں خیال آیا کہ پیسے تو ہیں نہیں۔ پھر سوچا کہ جانے بھی دو بات رہ جائے گی کہ وعدہ کر کے وعدہ خلافی کرتے ہیں۔ ہماری فریدہ تو موجود ہے ہی۔ بھیّو جب تمھاری شادی ہو جائے گی تو بڑی مصیبت آئے گی۔ کہاں سے روپیہ لاؤں گا۔ تم سے اتنا سہارا ہے کہ آڑے وقت میں کام آجاتی ہو۔ ورنہ بوا تو ذرا پیسہ دے دیں۔" اس نے معنی خیز نظروں سے فریدہ کی طرف دیکھا۔ سمجھ گیا کہ یہ حربہ کام آگیا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "بس کل تین روپیہ کی ضرورت ہے۔"

فریدہ چونک پڑی "واہ دو آدمی ہیں۔ تین روپیہ۔ خوب بے وقوف بناتے ہو۔"

نہیں یہ بات نہیں۔ میں اپنی چھوٹی سی بہن کو بے وقوف بناؤں گا جو دو مہینہ کی اور مہمان ہے —— نہیں دیکھو احمد کو جب لے جاؤں گا تو ضمیر کو بھی لے جانا لازمی ہے ہمچشموں میں بات رکھنی ہے۔ دیکھا نہیں اس غریب نے پچھلے ہفتہ میری کتنی زوردار دعوت کی تھی۔"

فریدہ لاجواب ہو گئی۔ آہستہ آہستہ اس نے قدم بڑھائے

تین روپیہ کے لئے بھیّا کو ناراض کر دینا بڑی بُری بات ہے۔ پھر کہیں وہ روز تھوڑی آویں گی۔ معلوم نہیں کہاں ہوں کہاں نہیں۔"

وہ آہستہ آہستہ اپنے صندوق کے پاس پہنچ گئی "اچھا تو آپ وہیں رہیے" اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

ہیں کوئی تمھارے روپیہ تھوڑا ہی چھین لوں گا۔ بڑی ہوشیار ہوتی جا رہی ہو۔ اب تو سہیل بھائی کے روپیہ رکھے گی نا ـــ"

"پھر وہی مذاق۔ اچھا جائیے۔ نہیں دیتے۔ لے لیجئے ایک پیسہ چھوڑے دوں؟"

"اچھا لاؤ اب نہیں کہتے۔ دیر ہو گئی ہے۔ مجھے کپڑے بدلنے ہیں"۔

فریدہ نے تین نوٹ تین روپے کے رشید کو نکال کر دیئے۔

رشید نے فوراً جیب میں رکھے۔

"میری بھتو کتنی اچھی ہے میں جانتا تھا کہ فریدہ مجھے نا آمید نہ کرے گی میری بھتو" اس نے آہستہ سے کہا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ بس اب ٹھیک ہے۔ ایک روپیہ گیارہ آنہ کے ٹکٹ۔ پانچ آنہ کی سگرٹ اور ایک روپیہ جیب میں ـــ اس نے دل ہی دل میں حساب لگا لیا۔ بس اب تو احمد کو سینما کی دعوت دے ہی دوں۔ احمد کی کوٹھی پاس ہی ہے۔ اس کی کوٹھی بھی کتنی خوبصورت ہے آبا جان دو سو روپیہ پا رہے ہیں لیکن یہ نہ ہوا کہ سلیقہ سے ایک مکان ہی بنا ڈالیں اب تو خیر گرانی کا نام ہے۔ لڑائی سے پہلے جب سو روپیہ پاتے تھے تو کیا کم تھے مگر جب ہی کچھ نہ کیا۔ پیسہ نہ ہونا بھی واللہ کتنی بڑی مصیبت ہے۔ احمد کو دیکھو کبھی اس کے پاس روپیہ کی کمی نہیں ہوتی۔ ہر وقت جیب بھری اور یہاں دیکھو تین روپلی کے لئے فریدہ کی خوشامد کر رہے ہیں۔ پھر احمد میری دعوت بھی تو کرتا رہتا ہے۔ اچھے سے اچھے کھانے میز پر لگے رہتے ہیں۔ اور یہاں دو ایک سال میں جا کر کہیں توفیق ہوتی ہے اور اس پر بھی جتنی باتیں سننا پڑیں کم ہیں۔"

اسے غصہ آنے لگا۔ اتنے میں احمد کی کوٹھی آگئی۔ اس نے نوراً نوکر سے احمد کو بلانے کو کہا اور باہر رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا —— دس پندرہ منٹ بعد احمد اندر سے آیا۔

"کہیں اُستاد کیسے آئے؟"

اماں یار آج چلو تان سین دیکھتے آئیں۔ گانے غضب کے ہیں اور پھر خورشید بھی تو ہے؟"

"کون سا شو؟"

"پہلا والا جو ساڑھے سات بجے شروع ہوتا ہے چھ بج گئے۔ ذرا جلدی ہی چلنا چاہیئے۔"

"اچھا تو ہے —— میں بھی سوچ ہی رہا تھا کہ آج کیا کیا جائے؟"

"اچھا تو پھر ضمیر سے بھی لگے ہاتھوں کہتا آؤں؟"

"اچھا جاؤ۔"

"مگر یار دیر بہت ہوگئی ہے مجھے ذرا نہانا بھی ہے۔ اس واسطے ایسا کرو کہ تم اپنے نوکر کو بھیج دو؟"

"اچھا —— تم جاؤ تیار ہو کر آؤ۔ میں نوکر کو بھیجے دیتا ہوں —— لیکن دیر مت کرنا"۔ رشید دوڑتا ہوا گھر پہنچا۔ وہ اس سوچ میں تھا کہ کیا پہنے —— بادامی سوٹ لے دے کے تھا اور اسے کئی مرتبہ پہن بھی چکا تھا۔ روز روز ایک ہی کپڑا پہنتے ہوئے اچھا بھی تو نہیں معلوم ہوتا۔ اس کی نظر فریدہ کے اونی جمپر پر پڑی جس کا ڈیزائن اسے بہت پسند تھا۔ لڑکیوں کے لئے تو ٹھاٹ ہیں۔ لیکن یہاں ایک

سوٹ سے دوسرا ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ جب کہو کہ ایک گرم سوٹ بنوا دو مگر۔ ایک ہے تو اب کیا ضرورت ہے؟ یہ جواب ملتا ہے جیسے پچاسوں صندوق بھرے پڑے ہیں بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ احمد نے سرج کا کتنا اچھا سوٹ ابھی پرسوں ہی بنوایا ہے اور پھر اس کے ابا یہ کہہ رہے تھے کہ اور تو ضرورت نہیں ؟۔

حالانکہ اس کے پاس دس بارہ سے تو کم نہ ہوں گے۔ خیر اب اس وقت کیا کیا جائے اس کے سامنے یہ خیال بے حد پریشان کن تھا سنیما نہ جاتا تو اچھا تھا۔ اب جائے تو کیا پہن کر ——— اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے چوڑی دار پاجامہ اور قمیص نکالی۔ بنیان بھی تو بے دے کر کل آٹھ رہ گئے تھے۔ خیر یہی سہی۔ آج اپنی پرانی شیروانی پہن کر جائے گا۔ وہ چارپائی پر کپڑوں کے پاس لیٹ گیا۔ اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اب کیا سوچے۔ فریدہ کپڑوں کا ایک بنڈل لئے ہوئے وہاں رکھنے آئی۔

"بھیّا ب——" اس نے کہا یہاں کیسے پڑے ہو کچھ طبیعت خراب ہے؟"

"نہیں تو ——" یہ کہہ کر وہ اٹھا ہوا غسل خانہ میں کپڑا لے کر چلا گیا۔ آدھے گھنٹہ بعد وہ نیا ہو کر آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا۔ اتنے میں آواز نے اسے تھوڑی دیر کے لیے گھبرا دیا۔ بوا فریدہ سے کہہ رہی تھیں وہ آج معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے پھر کہیں جانے کی تیاری کر لی ہے۔ اس لونڈے نے بھی اچھی مصیبت ڈالی ہے۔ گھر پہ تو بیٹھنا جانتا ہی نہیں۔ اس نے ایک ایک لفظ سن لیا تھا۔ اب ان کو سمجھانا ہے۔ اس کی زندگی کتنی خراب ہے۔ تین چار گھنٹے کے لئے گھر سے باہر بھی نہیں جا سکتا۔ بات بات پر جواب دہ ہونا پڑتا ہے۔ ان کے ساتھ آدھ گھنٹے

مغز کھپائی کیجیے تو کہیں جا کر سینما جانے کی اجازت ملے گی۔ ہاں لیکن روپیہ ملنے کی بات ہو پھر یہ بھی سہی مگر یہاں تو یہ اُمید آسمان سے نہیں۔ اس نے کنگھا جیب میں رکھا اور کمرے سے باہر نکلا ہی تھا کہ بوا نے کہا۔

"کہاں چل دیئے بن ٹھن کے۔ میں کہتی ہوں کہ آخر کس دن تجھے ہوش آئے گا۔ ذرا بھی گھر کی پروا نہیں؟"

"گھر کو میں کیا کروں کیا بھاڑ میں جھونکوں"

"ہاں اور کیا؟" تیرا بس چلے تو گھر بار ماں بہن سب کو آگ میں جھونک دے۔"

"اچھا تو خیر یہ جھک جھک ختم کیجیے۔ میں سینما جا رہا ہوں۔"

"پھر وہی روز روز سینما۔ کوئی حد بھی تو ہو۔ کھانے کو ملتا نہیں اور یہ سینما ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ بیٹا اب بھی سنبھل جاؤ۔ نہیں تو پچھتاؤ گے۔ بڑوں کا کہا اور آنولہ کا کھایا بعد ہی میں پتہ چلتا ہے۔"

رشید غصہ میں باہر نکل گیا۔ بوا برابر بڑبڑا رہی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لونڈے کو کیا ہو گیا۔ کہنا مانتا نہیں گھر میں کھانے کو نہیں اور اسکو ہری ہری سوجھتی ہے ———"

رشید دور چلا گیا تھا۔ بوا کی آواز سنائی تو نہیں دے رہی تھی۔ البتہ اس کے کانوں میں ابھی تک گونج رہی تھی یہ بھی سمجھا گئیں احمد کے پاس مت بیٹھو بڑے آدمی ہیں سینما مت دیکھو۔ بس ان کے لئے دن رات پڑھو۔ تا کہ صحت خراب ہو۔ ابا دن تو خوشی سے کہا ہو تا کہ لے بیٹا سینما دیکھ آ ———

نیبسے بڑی محبت آتی ہے۔ ان کی محبت سے خدا بچائے۔

اس نے دیکھا کہ سامنے احمد نیلا سوٹ پہنے کھڑا ہے —— نیلا سوٹ —— یہ کوئی نیا معلوم ہوتا ہے میں نے تو اسے نہیں دیکھا چالیس روپیہ گز سے کم تو نہ ہوگا یہاں زندگی بھر میسر نہیں۔ واللہ ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ اس وقت اسکے احساسات اپنے عروج پر تھے۔

کیوں رشید ؟ تان سین ہے یا کوئی اور —— ورنہ ساری محنت برباد جائے گی۔ اماں ضمیر تو ابھی تک نہیں آیا —— رشید قریب آچکا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ نہ آئے تو اچھا ہے اس وقت رشید سینما جانے کی مسرت ڈھونڈ رہا تھا۔

"چلو اس کے یہاں چلو"

بھئی ابھی تو نوکر ہی نہیں آیا۔ معلوم نہیں بدمعاش کہاں رہ گیا۔ میاں چلو سینما چلو۔ میاں میرا خیال ہے کہ ضمیر گھر پر ہی ہوگا۔

دس کا گھنٹہ بجے دیر ہوگئی۔ اب تو آہی رہے ہونگے۔ بھیا بھی عجیب لاپرواہ ہیں جب دیکھو ہمیشہ ایسے ہی آتے ہیں بھلی دوستی۔ ان سے کہے کون جسے ڈانٹ کھانی ہو۔ بوا کڑتے بگڑتے تھک گئیں اور وہ اپنے خیال میں رہتے ہیں۔ احمد کا تو دن بھر کا وظیفہ ہو گیا ہے۔ فریدہ کو غصہ آنے لگا۔ بوا ابھی اپنے بستر پہ آرام کر رہی ہیں۔ بچے تو شام ہی کو سو گئے۔ اور یہ کوئی وقت ہے جاگنے کا۔ جاڑے کی راتیں، وہ بھی کہاں تک انتظار کرتی۔ آدھا بھی تو شاید بج گیا۔ مگر بھیا ؟ ——

وہ بستر پر لیٹ گئی بوا کا ڈر تھا۔ ورنہ وہ تو کب کا سو جاتی جب آئیں گے

تو ڈانٹ پڑے گی کہ اتنی رات گئے گھر میں آتے ہو اور نیند ایسی آ رہی ہے کہ پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس نے اُٹھ کر پانی سے منہ دھویا۔ اگر اس وقت چائے پی جاتی تو اس سے نیند اُڑ جاتی مگر سماوار کی آواز ——— اس سے یہ آواز جو نکلتی ہے اور یہ مصیبت ہے۔ بوا کی آنکھ نہ کھلتی ہوئی کھل جائے گی۔ بوا بھی تو ہر جگہ پابندی لگاتی رہتی ہیں جب دیکھو ڈانٹ ——— اس سے تو بھیّا بھی بگڑتے ہیں لیکن زیادتی تو وہ بھی کرتے ہیں۔ اب کھیل نہ جانے کب کا ختم ہو گیا ہو گا۔ تعلیمی فلم ——— اس کو ہنسی آ گئی۔ کیا بہانہ بناتے ہیں جب دیکھو کوئی نہ کوئی تعلیمی تصویر آ رہی ہے، بھیّا تو یہ کہتے ہیں اور اُدھر ابّا کہہ رہے تھے کہ ہندوستان میں تعلیمی تصویریں نہیں آتیں۔ بڑا بہانہ کرتے ہیں یہ بھیّا ——— اس کی نیند کچھ کم ہو گئی تھی۔ چائے بنائے یا نہ بنائے۔ خواہ مخواہ کو بوا ڈانٹے گی۔

وہ اپنے کپڑوں کی پٹلیا لے آئی اور اس نے سینا شروع کر دیا۔ اب اس کی گھبراہٹ ختم ہو گئی تھی۔ تھوڑے ہی دن میں اس کی شادی ہو جائے گی۔ سینما تو وہ بھی دیکھتے ہونگے۔ ان کا بھی وہ انتظار کیا کرے گی۔ اس کو اب لطف آنے لگا تھا۔ لیکن پھر تو وہ خود بھی سینما جائے گی۔ مجھے تو ضرور دکھائیں گے۔ بڑا مزا آئیگا۔ پھر تو خوب اچھا رہے گا۔ سینما کا پردہ اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں سوئی بڑی تیزی سے چل رہی تھی ——— سینما کا پردہ اور تصویریں ——— وہ آہستہ آہستہ مسکرا رہی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر جھینپ گئی۔ نیند غالب آ چکی تھی۔ اس نے کپڑے میں سوئی لگا کر رکھ دی اور اُچھل کر تکیہ میں منہ چھپا کر لیٹ گئی۔ وہ بھی کیسی کیسی باتیں سوچتی ہے۔ سب لڑکیاں ہی سوچتی ہوں گی۔ لیکن بنّی کیسی ہیں۔ جیسے اُن کو کوئی خوشی

نہیں ہے۔ دل میں چاہے پھپھولے پھوٹتے رہیں اور کوئی پوچھے تو منہ چھپا لیتی ہیں

—— اس نے تکیہ میں سے سر نکال لیا۔ اور کپڑوں کو اٹھا کر پھر سینے لگی۔ کتنی دیر ہو گئی ابھی تک بھیا نہیں آئے وہ اتنا کپڑا ابھی سی چکی تھی۔ کہیں بیٹھے گپ ہانک رہے ہوں گے۔ ان کو کیا فکر —— یکایک چارپائی کی ادوان کی آواز آئی —— وہ گھبرا گئی بوا ابھی تک جاگ رہی ہیں —— نہیں سو گئی ہوں گی —— ابھی تو کروٹ کر لی ہے ——

بیٹی ابھی سوئی نہیں کیا کر رہی ہے۔ رات ہو گئی —— بھیا آگیا؟ آخری دو لفظ نہ کہتیں تو وہ جواب دے دیتی۔ مگر اب کیا جواب دے جھوٹ بولے؟ وہ گھبرا گئی۔ کہیں ادھر نہ آجائیں۔ کبھی ڈانٹنے ہی کے لیے آئیں۔ سچ بولی تو بھی بگڑیں گی۔ کہ اتنی رات گئے نہیں آئے —— جھوٹ بولے سچ بولے —— ہائے اللہ کیا کرے۔ یہ تمام خیالات یکایک اس کے دماغ میں برآمد ہوئے —— وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ آخر کیا جواب دے لیکن فوراً کسی خیال نے اس کو مطمئن کر دیا۔

ابھی نہیں سوئی۔ ابھی بجا بھی کیا ہے اندھیری رات ہے۔ اس لئے معلوم ہو رہا ہے جیسے ۱۱ بج رہے ہیں —— ۱۱ اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا وہ ناراض ہو گئی کہ اس نے کیوں کہہ دیا۔ خیر جانے بھی دو۔ بوا کچھ بڑبڑا رہی تھیں اس نے سنا نہیں۔ لیکن سمجھ گئی کہ کیا کہہ رہی ہونگی اور اس کا قیاس صحیح بھی تو تھا صبح سے انہیں غصہ آ رہا تھا۔ اور پھر ادھر بغیر اجازت چلے گئے۔ لیکن اسوقت جھبیا نہ آئیں تو اچھا ہے۔ بوا سو جائیں تو ٹھیک تھا اور اسی لیے اس نے کچھ نہیں

کہا کہ بڑبڑاتے سو جائیں وہ خاموش رہی اور برابر کپڑا سیتی رہی ——— کوئی پندرہ منٹ ہو گئے۔ اب تو بوا سو گئی ہوں گی۔ بڈھے آدمیوں کو نیند کیوں نہیں آتی۔ اس کو اتنی آتی ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا بات ہے۔ کہتے ہیں کہ نوجوانوں کو نیند بہت آتی ہے بیجوانوں ؟" اس کے دماغ میں آ تو گیا۔ لیکن وہ شرماسی گئی۔ آخر اس میں کون سی بات ہے بوا دن بھر میں پچیس مرتبہ تو کہتی ہیں اور اب اس کو سوچنے سے شرم سی آرہی تھی۔

کھٹ ——— کھٹ ——— فریدہ سو گئی کیا ؟ ——— کھٹ کھٹ اس نے "اچھا" آہستہ سے کہا اور وہ گھبرا گئی۔ کھٹکھٹائے جا رہے ہیں مانتے ہی نہیں بوا جاگ گئیں تو میرا کیا ہے۔ ان کو خود ہی تکلیف ہو گی۔

اس نے دروازہ کھول لیا۔ آہستہ سے چلے آیئے بوا بگڑ جائیں گی کہاں رہ گئے تھے جو اتنی دیر لگا دی۔ رشید خاموشی سے اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گیا اور جوتے اتارنے لگا۔ فریدہ باورچی خانہ میں گئی کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس نے انگیٹھی میں کچھ کوئلہ ڈال کر دہکائے تب کہیں جا کر کھانا گرم ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ برتن اٹھا رہی تھی کہیں بوا کی آنکھ نہ کھل جائے۔ سالن بھی گرم کرنے سے چھن چھن ہوتا تو اسے ڈر معلوم ہوتا کہ اب بوا نے منہ کھول کے دیکھا اور چلائیں۔ معلوم نہیں کو ان بڑی بوڑھیوں کو اس قدر غصہ کیوں آتا ہے ؟ ۔

ذرا سی بات ہوئی اور سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ مگر یہ بات تو ہے بھی غصہ کی۔ آدھی رات تک گھر سے غائب رہنا۔ کھانا رکھا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ میں نہ ہوں تو بھیا کو پتہ چلے۔ وہ سوچتے سوچتے چونک سی پڑی۔ آخر کہاں چلی جاگی

ہاں اب اس کی شادی ہو جائے گی ——— سسرال ——— وہ آپ ہی آپ جھینپ گئی۔ وہ کیسی کیسی عجیب باتیں سوچنے لگتی ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ کف گیر منہ کے قریب ہو کر لگایا ہی تھا کہ مرتے ہی وہ کسی طرح ہلکی سی آواز سن لیں۔ ہماری بوا کے بھی تو کان ادھر ہی لگے رہتے ہیں جہاں برتن کی آواز ہوئی اور وہ چلائیں "کون ہے"۔ فریدہ کے ہاتھ سے کفگیر چھوٹ گیا اور دیگچی کے کنارے سے لگتا ہوا زمین پر آ رہا "غضب ہو گیا" فریدہ کے منہ سے نکلا اس نے زبان دانتوں کے بیچ میں دبالی اور اس کا دل پتہ کی طرح ہلنے لگا ———

"اللہ ماری بلی نے کھالیا ———" بوا جاگ چکی تھیں۔ انھوں نے رضائی سے منہ نکالا "فریدہ! ——— او فریدہ؟ دیکھ بلی نے دودھ کھول لیا کہیں سب چٹ نہ کر جائے"۔ اب فریدہ بولے تو کیا بولے بس اب آفت آ گئی وہ چپکی رہی۔ بوا پھر گرجیں "ایسی نیند بھی کیا ہے؟ میں چلا رہی ہوں۔ چور بھی سارا گھر اٹھا کے لے جائیں تو اسے پتہ نہ لگے"۔ اب بوا خود ہی بستر میں سے نکل پڑیں اور ننگے پاؤں باورچی خانہ کی طرف دوڑیں۔ خاموش رہے تو اب اور بھی ڈانٹ پڑے گی۔

"کیا ہے بوا جی!" فریدہ نے بڑے پیار سے کہا۔ بوا کچھ ٹھنڈی سی پڑیں "تو ہے فریدہ۔ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہے"۔ انگیٹھی کی طرف جو دیکھا تو آگ دہک رہی تھی۔ بوا کے تن بدن میں بس آگ ہی تو لگ گئی۔ انھیں یاد آ گیا کہ رشید سینما دیکھنے گیا تھا۔ اب واپس آیا ہو گا۔

"کھانا گرم ہو رہا ہو گا —— اونہہ —— نواب صاحب اس وقت تشریف لائے ہیں۔" وہ آپ ہی آپ بڑبڑائیں۔ فریدہ اب اطمینان سے کھانا گرم کر کے کھانے لگی۔ بوا کو خبر تو ہو ہی گئی۔ اب ڈر کس کا تھا۔

"مجھے تو اس اولاد نے کھا لیا ہے۔ دن بھر کام کرتے کرتے تھک کے چور ہو جاتی ہوں۔ رات کو بھی پڑنے کی چین نہیں۔ جانے کیسی اولاد ہوتی ہو گی جو ماں باوا کو سکھ پہنچاتی ہو گی۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے بستر میں جا کے لیٹ گئیں۔ فریدہ بھی کھانا لے کر کمرہ میں چلی گئی۔

"بارہ ایک بجے گھر میں آ گھستے ہیں اور پھر دس بجے اٹھیں گے۔ جبھی تو گھر میں نحوست برس رہی ہے۔" وہ بستر میں لیٹی لیٹی بڑبڑا رہی تھیں۔ "روز سینما —— آخر فرنگیوں کے ڈھنگ لئے ہیں نا۔ اللہ کا نام نہ رسول کا۔" رشید اور فریدہ خاموش تھے۔ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ بڑبڑاتی سو گئیں۔ جب جا کر رشید کی کہیں جان میں جان آئی۔

"فلم دیکھ آئے؟" فریدہ نے کپڑے میں سے سوئی نکالتے ہوئے کہا۔ "ہاں بڑی اچھی تعلیمی فلم تھی۔" اور پھر اس طرح ہنس کر فریدہ کی طرف دیکھا جیسے اس کا شکریہ ادا کر رہا ہو اور یہ سچ بھی تھا اگر وہ پیسہ نہ دیتی تو ضرور فلم دیکھتے، بوا تو پھوٹی کوڑی بھی دینے والی نہیں ہیں بلکہ ڈانٹ بتاتی ہیں۔

"احمد آج بڑا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ بڑا قیمتی معلوم ہو رہا تھا۔"

آج اس کے ذہن میں ہر پھر کے وہی سوٹ گھوم رہا تھا۔ کتنا خوبصورت

تھا وہ سوٹ ا۔

”نیلا سوٹ —— ہوں ——“

فریدہ نے ایسے جواب دیا جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ اور اس کے لئے بات بھی کیا ہوسکتی تھی روزانہ اپنی شادی کیلئے کپڑے جوڑے سیتی تھی نیلے پیلے، معلوم نہیں کس کس رنگ کے۔ ایک سے ایک بڑھیا —— قسمت تو اسی کی خراب ہے۔ سال دو سال میں کبھی ایک شیروانی مل گئی چلو چھٹی ——

”لو اٹھاؤ ——“ رشید نے کھانا بھی تھوڑا ہی کھایا، کچھ بھوک نہ تھی اور پھر بوا کی جھجک نے تو اور بھی بھوک غائب کردی۔

فریدہ کپڑے میں سوئی لگا کر کھڑی ہوگئی۔

”ارے بارہ بج گئے“ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ”فریدہ اب تم بھی سو جاؤ“

”اور نہیں تو کیا رات بھر پہرا دوں گی“ وہ جل کے کوئلہ ہوگئی“۔ رشید ضائی میں منہ ڈھانپ کے سو گیا اور فریدہ بھی روشنی بجھا کے اپنے بستر میں جا لیٹی

رشید کو نیند نہ آئی اسے بھی ہمیشہ کوئی نہ کوئی پریشانی رہتی ہے آخر یہ پریشانیاں سب اسی کے لئے کیوں رہ گئی ہیں۔ دنیا میں کوئی اور ہے ہی نہیں —— ویسے تو وہ قسمت کا قائل نہ تھا مگر آج نہ جانے کیوں رہ رہ کر اپنی قسمت پر افسوس کر رہا تھا۔ یہ لفظ غیر ارادی طور پر اس کے ذہن میں آتا —— اپنی قسمت بھی کیسی ہے —— ہمیشہ تو وہ مالی پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ روپیہ پیسہ کی کمی اس کے لئے ہمیشہ سوہان روح ثابت ہوئی ہے آج

تو فریدہ نے کام چلا دیا اب وہ کہاں تک میری مدد کریگی پھر اس کی شادی ہو جائے گی۔ اپنے گھر کی ہو رہے گی۔ آج اسے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ روپیہ انسانی زندگی کی باگ ڈور تھامتا ہے۔ روپیہ ہی ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے —— کتنی رات ہو گئی اب اس کو سونا چاہیئے۔ صبح جلد اٹھنا ہے۔ مگر صبح کو کیا ہوگا۔ احمد کی دوستی بھی میرے لئے بھاری ہو گئی —— پھر پاسے ایسی دوستی سے —— مگر اب تو نباہنا ہی پڑے گا۔ بڑے آدمیوں کی دوستی ایسی ہی مہنگی پڑتی ہے۔ مگر اس میں اسی کی غلطی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی والدہ کتنی سختی برتتی ہیں چار پیسے تک تو دینا جانتی نہیں۔ یہ سب باتیں ہیں مگر پھر بھی میں نے دعوت دیدی۔ آخر ایسا کونسا موقع تھا۔ خواہ مخواہ میں نے اپنے گلے میں یہ مصیبت ڈال لی۔ جہاں اتنے دن سے نہیں پوچھا تھا اور سہی۔ مگر مجبوری بھی تو تھی۔ اس نے معلوم نہیں کتنی مرتبہ دعوت کی تھی اور کیسی کیسی چیزیں کھلائیں —— اور اس نے تو کبھی اس کو جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھا۔ لیکن وہ پیسہ والا ہے اپنی حیثیت بھی تو دیکھنی چاہیئے —— ایکدم اُسے کچھ یاد آیا۔ اور وہ ہنس پڑا۔ بچپن میں اس نے کاہلی اور چستی کا مقابلہ پڑھا تھا اس وقت وہ اس کو دوسرے معاملہ میں دوہرا رہا تھا۔ خود ہی ایک بات کہتا اور خود ہی اس کو کاٹنے کی فکر میں کوئی دوسری دلیل پیش کرتا۔ فریدہ کی آنکھ لگتی جا رہی تھی کہ اس بے موقع ہنسی سے وہ جاگ اٹھی۔

"کیا ہے بھیا! کیوں ہنس رہے ہو"

"گویا ہمارے ہنسنے پر بھی پابندی ہے۔"

"آپ بھی کیسی بات کرتے ہیں۔ پابندی کون کرتا ہے۔ لیکن آخر یہ آدھی رات گئے ہنسنے کا کونسا وقت ہے۔"

رشید کچھ لاجواب سا ہو گیا۔ کمرہ میں دوبارہ خاموشی چھا گئی ——

رشید بھی سو گیا۔

اگلے روز رشید خلاف معمول صبح ہی صبح جاگ اٹھا۔ آج اسے بوا کو راضی کرنا تھا۔ کاش وہ دعوت میں روڑا نہ اٹکائیں۔ اب کوئی روز روز تو وہ دعوت کرنے جا نہیں جا رہا ہے۔ پھر بعد میں امتحان قریب آ رہے ہیں —— پھر کون کسی کی دعوت کرے گا — وہ پھر سوچنے لگا اس نے دعوت دے تو دی مگر اب بوا کو راضی کیسے کیا جائے۔ وہ تو دور ہی سے کھانے کو دوڑتی ہیں "فریدہ" اس نے کتاب پڑھتے پڑھتے کہا۔ "کیا کر رہی ہو؟" "سی رہی ہو؟"

"ہاں" فریدہ نے مقیش پر نظریں گاڑے گاڑے جواب دیا۔ وہ دوپٹہ کے پلوؤں پر مقیش ٹانک رہی تھی۔

"یہاں آنا بھئو؟ کام ہے"

"کیا کام ہے"۔ وہ بولی

"بڑا ضروری —— بس تم ہی کر سکتی ہو" رشید یہ کہہ کر ہنس پڑا اور فریدہ کچھ جھنجھلا سی گئی — ہو گا کام۔ پھر روپیہ کی ضرورت پڑی ہو گی — میرے پاس اب روپیہ وپیہ نہیں رکھے۔ تین بھتے وہی کل دیدیئے تھے یہ بھی تو خیال نہیں کرتے کہ اس کا دل بھی کسی چیز کو چاہتا ہو گا۔ ایک تو کچھ لانے سے

گئے اور ــــ وہ دل ہی دل میں بڑبڑانے لگی۔

"فریدہ بھنو! ــ اپنے بھیا کی بات سن لیا کرو" اس نے ایسی محبت اور خوشامد سے کہا کہ فریدہ کو رحم سا آگیا۔ اور وہ پلّو میں سوئی لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہے؟" ــــ فریدہ کو ہنسی سی آگئی۔

"بڑا ضروری کام ہے میری بھنو ــــ بس میری عزت کا سوال ہے"

روز روز میں روپیہ کہاں سے لاؤں۔ آپ نے تو قارون کے خزانے کا مالک مجھی کو سمجھ لیا ہے"

رشید ہنس پڑا "اسے تو ہر وقت روپیہ ہی کا خیال رہتا ہے"

اس نے دل میں سوچا۔

"بھنو روپیہ نہیں چاہیئے؟"

"پھر اور کیا کام ہے" فریدہ نے ایسے کہا جیسے وہ روپیہ کے علاوہ رشید کا اور کوئی دوسرا کام کر ہی نہیں سکتی۔

"کہاں گئی فریدہ" پاپا باہر سے چلائیں یہ سارا دن اسی طرح ختم کر دیتی ہے ایک کپڑا ابھی تو سل کے تیار نہیں ہوتا۔

اچھی مصیبت میں جان ہے۔ سارے دن سیتے سیتے آنکھیں پھوٹ جاتی ہیں مگر یہ بگڑی ہی رہتی ہیں۔

"جاؤ بھئی تمھاری شادی کے کپڑے ہیں سیو۔ مت کرو ہمارا کام"

"آپ کام تو بتایئے میں منع کب کر رہی ہوں"

"بات یہ ہے بھنو کہ احمد کئی دن سے سر ہو رہا تھا کہ چائے کی دعوت دو

اور میری تو وہ بیسیوں دفعہ دعوت کر چکا ہے اس لیے میں منع بھی نہ کر سکا۔"

"ہاں تو پھر یہ کہنے کہ آپ دعوت کہہ آئے" فریدہ ہنسی جیسے اس پر طنز کر رہی ہو۔ اب بوا کی ڈانٹ بھی تو خوب کھانی پڑے گی۔ کوئی یہ تو ہے نہیں کہ چپکے سے روپیہ نکال کر دیجیے اور بوا کو خبر نہ ہو۔۔۔۔"

"تو پھر کیا ہو گا بھنو۔۔۔۔" رشید نے جوتا مار کی "کسی طرح بوا کو راضی کر دو۔ دیکھو چار بجے احمد آئے گا اگر چائے، ناشتہ نہ تیار ہوا تو بڑی شرمندگی ہو گی۔ اور پھر میں عمر بھر اُسے منہ نہیں دکھا سکیں گا۔"

"میں کیسے راضی کروں ۔۔۔ آپ خود ہی کہہ دیجیے نا ۔۔۔" فریدہ اکڑی جیسے ساری دنیا کا نظام اسی کے ہاتھ میں تو ہے۔ دنیا کا ہو یا نہ ہو رشید کا تو ہے ہی۔ وہ چاہے تو ذراسی دیر میں درہم برہم کر دے

"اری فریدہ! ۔۔۔" بوا باہر سے چلائیں "کہاں چلی گئی"

"آرہی ہوں" فریدہ نے جل کے جواب دیا۔

"تو بھنو کر دو گی ہمارا کام۔ دیکھو پھر ہم تم سے کوئی کام نہیں کہنے کے اور ایک مہینہ بعد تو تم خود ہی سسرال چلی جاؤ گی۔ تم کہاں ہو گی۔ ہم کہاں ہوں گے پھر کون تم سے کام کہنے جایا کرے گا۔

"دیکھئے پھر وہی مذاق ۔۔۔ جائیے میں بھی آپ کا کوئی کام نہیں کر کے دوں گی۔"

"نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ میری اچھی سی چھوٹی سی بہن ناراض ہو گئی کیا۔ اچھا جاؤ بوا کو راضی کر لو ۔۔۔ انعام دوں گا ۔۔۔ بڑا اچھا انعام" ۔۔۔

وہ ہنس پڑی "اچھا کہہ دونگی"۔ چلئے وہ مذاق میں روٹھ رہی تھی بیاہ کے نام سے تو اور اس کے دل میں گدگدی سی ہونے لگتی ہے۔ شادی سسرال نہ جانے کیوں بار بار اس کے ذہن پر چھانے لگے۔ اونہہ — وہ سوچتے سوچتے تھک سی جاتی۔ ہر چند وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر ہر وقت تو گھر میں شادی کا ذکر رہتا تھا۔ آخر وہ بھولے بھی کس طرح۔ اس کے دل میں ایک عجیب سی گدگداہٹ محسوس ہوتی اور پھر وہ خود ہی شرما جاتی۔

شام ہوئی کسی نہ کسی طرح بوا کو راضی کر ہی لیا گیا اور فریدہ نے کچھ ایسی پٹی پڑھائی کہ بوا خود ہی چیزیں پکانے میں مدد دے رہی تھیں۔

"جلدی جلدی پھرتی سے کام کرو بیٹی! —— چار بجا ہی چاہتے ہیں"۔

اور دونوں ماں بیٹیوں کے ہاتھ چرخی کی طرح چل رہے تھے۔ بڈھے ماں باپ کو چلانے میں لڑکیوں کو بھی کمال ہوتا ہے۔ کتنی چالاک ہوتی ہیں یہ لڑکیاں۔ رشید دل ہی دل میں اس کا قائل ہو چکا تھا۔ جبھی تو جھٹ سے بوا کو راضی کرنا ہوتا تو فریدہ سے کام نکالتا وہ کسی نہ کسی طرح ان کے غصہ کو ٹھنڈا کر ہی لیتی تھی۔

"چائے تیار ہو گئی بجو؟" رشید نے فاتحانہ انداز میں آکے پوچھا کیونکہ اب بوا بگڑیں بھی تو کیا۔ اس کا کام تو بن ہی گیا۔ اور وہ بگڑتی کب نہیں مگر جب اپنا کام ہو جاتا ہے تو چلاتی رہیں۔

"کس کمرہ میں ناشتہ لگے گا۔ میں نے تو برابر کے کمرے میں میز لگا دی

ہے۔ جس کا دروازہ باہر کو کھلتا ہے۔"

"ہاں —— ہاں —— بس ٹھیک ہے تم تو خود ہی سمجھدار ہو۔ بس ذرا جلدی کرنا کیونکہ مجھے پانچ بجے کی ٹرین سے جانا ہے۔" رشید یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔ اور بوا کے تو سنکر جیسے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی ہو۔ وہ کڑاہی چولھے پر سے اُتار رہی تھیں۔ اُنھوں نے غصہ میں اس زور سے کڑاہی نیچے رکھی کہ گرم گرم گھی کی چھینٹیں دور تک گئیں۔

"ایسی بھی کیا اولاد جو ماں باوا کو کچھ سمجھتی ہی نہیں —— سر کے اوپر امتحان آگیا اور صاحبزادہ ہیں کہ تفریح کرتے پھرتے ہیں۔ سال بھر کتاب اٹھا کے نہیں دیکھی ——" بوا سب پھینک پھانک کر کھڑی ہو گئیں۔

"لگا دیا فریدہ بٹیّو؟" رشید باہر سے آگیا۔ فریدہ بولنے بھی نہ پائی کہ بوا برس پڑیں۔ لیکن رشید خاموشی سے سُن رہا تھا جیسے وہ پہلے ہی سے اس حملہ کے لئے تیار تھا۔

"تو بوا جی آپ کو فریدہ کیلئے کپڑا اور گوٹا بھی تو منگانا ہے۔ آپ اس کے لئے بھی تو کسی کو بھیجئے گا نا —— وہ میں ہی لادوں گا۔"

بات کچھ ٹھیک بھی تھی۔ بوا کچھ ٹھنڈی پڑیں —— اور رشید نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کا یہ حربہ اپنا کام کر گیا —— بوا بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں اور رشید پھر باہر کو چل دیا۔

فریدہ جلدی جلدی سب چیزیں میز پر لگانے لگی۔ معلوم نہیں کتنے مہمان آئیں گے اس نے ویسے ہی چھ پیالیاں لگا دیں —— کتنے ہی ہوں

چیزیں تو اس نے بہت تیار کر لی تھیں۔ دوپہر سے لگے لگے یہ وقت آگیا۔ آج تو کپڑے میں ٹانکا بھی نہ لگا۔ اب رات کو اسے سر مارنا پڑے گا۔

"ارے بھائی رشید؟"

ایک گورے چٹے ہاتھ نے پردہ ہٹایا۔ فریدہ ادھر سے پیٹھ کیے برتن لگا رہی تھی۔ وہ چونک پڑی کون ہے اجنبی آواز ـــــ دروازہ کھلا رہ گیا تھا اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کوئی پردہ کے پاس کھڑا تھا۔ نیلا سوٹ ـــــ وہ گھبرا گئی۔ بھاگتی تو کدھر وہیں کرسی کی آڑ میں ہو گئی پردہ بھی فوراً ہی ہٹ گیا اسے کیا خبر تھی کہ یہاں کون ہے۔ نیلا سوٹ پہنے تھے۔ موٹے تازے۔ رنگ بہت سفید تھا۔ شاید جبھی تو سوٹ اتنا خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ یہ نہیں معلوم ہوتے ہیں کیا نام ـــــ نام اس کے ذہن سے اتر گیا نہیں بھیا کے دوست ـــــ ہاں ٹھیک ہے یہ احمد تھے۔ بڑے آدمی کے لڑکے ہیں کیسا بڑھیا سوٹ پہن رکھا ہے۔ اور کلائی میں گھڑی بھی تو باندھے تھے۔

"سب چیزیں لگا دیں بھیّو؟" رشید بھی باہر سے آگیا۔

وہ گھبرا گئی۔ کہیں وہی نیلے سوٹ والا نہ ہو۔ اس نے اس وقت یہ بھی تو نہ سوچا کہ وہ اجنبی آدمی اس سے باتیں کرنے لگتا؟ رشید بھی فریدہ کی مدد کرنے لگا

"آج تو نے بڑا کام کیا ـــــ میری عزت رہ گئی۔ جب ہماری بھیّو چلی جائے گی تو پھر ہم اکیلے رہ جائیں گے۔ کوئی بات بھی پوچھنے والا نہ رہے گا" مگر فریدہ چپ رہی وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

گال جیسے دہک رہے ہوں۔ کنپٹیوں سے آگ سے نکل رہی تھی وہ جلدی جلدی سب ٹھیک کرکے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

نیلا سوٹ۔ ہاں احمد ہی ہوں گے۔ بھیا کے دوست کئی دن ہوئے بھیا کہہ بھی رہے تھے کہ احمد نیلا سوٹ پہن رہا ہے۔ بڑا برھیا سوٹ ہے ہر پھر کے اس کے سامنے احمد ہی آکھڑا ہوتا۔ وہ پھر اپنا دوپٹہ لے کے بیٹھ گئی۔ اس کی سوئی گوٹے کے تاروں سے سرسر نکل رہی تھی اور سوچ رہی تھی شاید آج کہیں جا رہے ہیں —— بھیا بھی انھیں کے ساتھ جا رہے ہوں گے —— بھیا کہہ رہے تھے کہ احمد کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے وہ ابھی پڑھتا ہے۔ فریدہ نے اپنے سر کو جنبش دی۔ وہ بھی کیسی کیسی باتیں سوچ رہی ہے اُسے کیا مطلب اس کی شادی ہو یا نہ ہو اس کی تو منگنی ہو گئی ہے اور اب اگلے مہینہ میں شادی ہونے والی ہے اسے کیا حق ہے کہ وہ غیر مردوں کے متعلق سوچے پر اس میں اس کا کیا قصور وہ کوئی جان کے تو اس کے سامنے چلی نہیں گئی تھی۔ وہ تو مینز پہ برتن لگا رہی تھی اُسے کیا معلوم تھا۔ کہ وہ آجائے گا۔ کیسا بدتمیز آدمی ہے بغیر آواز دیئے ہی یہ وہ کھول دیا اس نے اپنے دوپٹہ کو ٹھیک کرکے اوڑھا جیسے وہ اس کے سامنے ہی تو کھڑا ہے۔ باہر ہی سے آواز دیتے —— اسے اپنے اوپر ہنسی آئی۔ پھر کیا ہوا اگر دیکھ لیا تو اس کا کچھ بگڑ تھوڑا ہی گیا اونہہ —— وہ جلدی جلدی گوٹا ٹانکنے لگی۔ احمد کی جب شادی ہوگی تو ان کی بیوی بڑی خوش رہا کرے گی۔ کتنا اچھا اس کا شوہر ہے۔ خوبصورت بیوی تو سب

ڈھونڈتے ہیں مگر یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ خوبصورت شوہر بھی ہو۔ جیسے لڑکیوں کے دل ہی نہیں ہوتا ان کے لئے تو بس شوہر تلاش کیا جاتا ہے چاہے کیسا ہی بدصورت ہو۔ جبھی تو زیادہ تر شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں ——

اس نے سیتے سیتے نظر اوپر اٹھائی۔ سامنے بڑا آئینہ لگا تھا گندمی رنگ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں یہ اسی کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بھی تو خوبصورت ہے اسے ایسا معلوم ہوا جیسے احمد نیلا سوٹ پہنے اس کے قریب کھڑا ہے وہ جھینپ سی گئی —— پر اس جھینپ میں بھی تو ایک لذت تھی۔

"فریدہ بھئی؟" ——

فریدہ نے مڑ کے دیکھا دروازہ میں رشید کھڑا تھا

"میں جا رہا ہوں۔ سب برتن اٹھا لینا"

"اچھا ——" وہ یہ کہہ کر چپ ہو رہی اور پھر سینے لگی

رشید اور احمد موٹر میں بیٹھے ہوئے اسٹیشن جا رہے تھے۔ زندگی میں ایسے موقع بھی کم آتے ہیں۔ اس نے اپنے سوٹ کی طرف ایک نظر کی گویا وہ اپنا جائزہ لے رہا تھا کہ آیا وہ اس موٹر میں بیٹھنے کا حق بھی رکھتا ہے وہ سوچنے لگا کون ہے جو مجھے دیکھ کر یہ کہہ دیگا کہ یہ شخص بہت کم موٹر میں بیٹھا ہی یا یہ موٹر اس کی نہیں ہے اس نے احمد کی طرف دیکھا اور پھر آپ کچھ شرمندہ سا ہو گیا یہ موٹر اس کی نہیں تو کیا ہے۔ دنیا میں کتنے ہیں جن کے پاس موٹریں ہیں۔ فی الواقع موٹر والے تو انگلیوں پہ گنے جا سکتے ہیں۔ موٹر والے کتنے

خوش قسمت ہوتے ہیں۔ اس نے دوبارہ احمد کی طرف دیکھا۔ موٹر پوری تیزی سے چلی جارہی تھی۔ ۳۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ رشید نے گھڑی کی طرف دیکھا یہ بھی عجیب چیز ہے۔ تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار کافی تیز تو ہوتی ہے۔ موٹر آگے جارہی تھی۔ پیدل چلنے والے راہ گیر دور رہ گئے تھے ــ زندگی ایک دوڑ ہے۔ رشید نے دل ہی دل میں کہا جس میں موٹر والے منزل پر پہلے پہنچتے ہیں اور پیدل چلنے والے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ وہ ہنسا۔ وہ بھی بعض اوقات کیسے کیسے فلسفیانہ خیالات کو اپنے ذہن میں جگہ دیتا ہے۔ وہ ایسی باتیں کیوں سوچتا ہے۔ جیسے وہ موٹر میں کبھی بیٹھا ہی نہیں۔ لیکن وہ کس سے کم ہے۔ اگر اس کے پاس موٹر نہیں ہے تو کوئی خاص کمی نہیں۔ اپنے دوستوں میں وہ کسی سے ہیٹا نہیں۔ سنیما وہ دکھاتا ہے دعوتیں وہ کرتا ہے اور آخر ایسی کونسی بات ہے جو اس میں نہیں ہے۔ ہاں موٹر ضرور اس کے پاس نہیں ہے۔ مگر اس سے کونسی کمی واقع ہوجاتی ہے۔

اس نے کھڑکی میں سر ذرا نکالا۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اتنے دن یہاں رہتے ہو گئے اور اسے یہ بھی معلوم نہ تھا لیکن اس میں اس کا کیا قصور موٹر کی بات ہے۔ موٹر بھی کتنی عجیب چیز ہے: ذرا سی دیر میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔

"رشید بھئی سیکری بھی جائیں گے؟"

"اچھا ــــــ"

رشید پھر خاموش ہو گیا۔ اس وقت معلوم نہیں کیوں وہ ایک عجیب

پریشانی میں مبتلا تھا۔ ایسی کونسی بات ہے جو اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ آخر کوئی بات بھی تو ہو۔ ہاں تو سیکری بھی جانا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور اس کے پاس مشکل سے سات روپیہ بچتے ہیں۔ پندرہ روپیہ تو ٹکٹ ہی میں خرچ ہوتے ہیں۔ انٹر کا ٹکٹ کاش وہ تیسرے درجہ کا ٹکٹ خرید سکتا۔ مگر یہ بھی تو مجبوری ہے۔ تیسرے درجہ کا ٹکٹ ——— ناممکن آخر احمد انٹر سے کم میں تو بیٹھنے سے رہا اتنے بڑے آدمی کا لڑکا ——— تیسرا درجہ ——— ناممکن ——— اس نے گردن کو زور سے جھٹکا دیا مگر انٹر میں بیٹھنے میں بھی تو مشکل ہے ——— کاش وہ احمد کا دوست نہ ہوتا۔ پہلے اس کی دوستی صرف مہنگی پڑتی تھی مگر آج اس کے لیے اس کا نباہنا مشکل ہو رہا تھا۔ پیسے والے کی دوستی ——— یہ اسی کی تو غلطی ہے۔ کتنے لڑکے تھے مگر اس میں سے اس نے اتنا بڑا انتخاب کیا۔ اظہر ہی میں کونسی برائی تھی کتنا ہنس مکھ ہے مگر میں نے اس کی غربت کی بنا پر اُسے ٹھکرا دیا خیر چھوڑو ان باتوں کو ادھنک ——— اس نے گردن کو جھٹکا دیا۔

"میاں اترو بھی ——— جیسے کبھی موٹر میں بیٹھے نہیں پھر کسی روز ٹہلا لائیں گے۔ چلو وقت کم ہے" ——— احمد نے ہنس کر کہا۔

رشید چونک پڑا۔ پانی پانی ہو گیا۔ کاش وہ اس وقت کچھ نہ سوچتا۔ کاش اس کے پاس بھی ایک موٹر ہوتی ——— کمتری کا احساس اپنی بلندی پر تھا۔ اُسے اپنی غربت پر غصہ آ رہا تھا۔ کاش وہ بھی دولتمند ہوتا۔ رشید موٹر سے اُتر چکا تھا مگر اس کا دماغ اس کا پیچھا چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس طرح اگر

وہ آگرہ گیا تو کیا خاک مزہ آئے گا۔ احمد کے ساتھ اس وقت وہ ایک منٹ کے لئے بھی خوش نہیں رہ سکتا ہے۔ مگر یہ تبدیلی یکایک نہیں ہونی چاہیئے۔ وہ اسٹیشن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ موٹر جا چکی تھی۔

"گاڑی چھوٹنے میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے ہیں؟" احمد نے کہا۔ رشید نہ جانے کیا سوچ کر رک گیا۔ "تم چلو میں ابھی آتا ہوں۔ ذرا اٹھیاں وقت معلوم کرلوں؟" احمد آگے بڑھ گیا۔ رشید وہیں رک گیا۔ خیالات کا ایک ہجوم اس کے دماغ میں آ رہا تھا۔ کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے۔ ٹکٹ کلکٹر کو دیکھ کر رشید اس کے پاس چلا گیا۔ مگر اس کی نظریں برابر احمد کا کا تعاقب کر رہی تھیں۔

"گاڑی میں کتنی دیر ہے؟" اس نے یہ سوال یونہی کیا۔ لیکن احمد کی جانب برابر دیکھتا رہا۔

"آپ کا مطلب کس گاڑی سے ہے، اور آپ کا یہ سوال تو کچھ مہمل سا ہے پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ سوال آنے والی گاڑی کے متعلق ہے یا جانے والی گاڑی کے ——"

رشید نے کوئی توجہ نہ دی۔ جیسے اس کا سوال پوچھنے سے مطلب ہی نا سرے سے تھا ہی نہیں۔

"آپ بھی عجیب آدمی ہیں؟" ٹکٹ کلکٹر یہ کہہ کر آگے کو بڑھ گیا۔ رشید کی نظر برابر احمد پر تھی جو دوسرے درجہ کے ٹکٹ گھر کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ رشید کانپ اٹھا۔ "میں احمد کے ساتھ نہیں جاؤنگا۔ ہرگز نہیں" اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ اس کا دماغی ہیجان پورے عروج پر تھا۔ وہ نیم پاگل سا ہو رہا تھا۔ پھر سر جھکائے واپس

چلا دیا ـــــ وہ گھر جائے گا ـــــ دوسرے درجے کے پیسے اس کے پاس کہاں۔ یہ حضرت تو بڑے آدمی ہیں وہ تو انٹر کا ٹکٹ بھی بمشکل تمام خرید سکتا ہے بڑے آدمیوں کے شوق۔ ان کی دوستی سے باز آیا۔ وہ اس وقت یہ محسوس کر رہا تھا کہ گویا اس کا دماغ کسی قید سے آزاد ہو گیا ـــــ موٹر میں آیا تھا مگر کتنا تھک گیا ہے اونچے طبقہ سے ہاتھ ملانا ناممکن ہے۔ اُسے متوسط طبقہ سے انتہائی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ ان لوگوں کی دوستی ـــــ آج طبقاتی کشمکش کا ایک پہلو رشید نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا جس کو بڑے بڑے سیاستداں نہ سمجھا سکتے تھے۔ کاش دنیا میں ایک انقلاب ہوتا جو ایک طبقاتی نظام قائم کر سکتا ـــــ جس میں ہر شخص انٹر کلاس میں سفر کر سکتا ـــــ تیسرا درجہ ـــــ گویا یہ ہیں تین طبقے ـــــ ان تینوں ڈبوں میں جتنی نزدیکی ہے اتنی ہی دوری کیوں ہے ـــــ

اس نے ہر جگہ احمد کا ساتھ دیا۔ ہر دعوت میں دوش بدوش بیٹھا سینما میں اس نے وہی ٹکٹ لیا۔ مگر ریل میں اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ اس وقت اس کا ساتھ دینے کی اس میں کوئی آرزو نہ تھی۔ آج اتنے عرصہ کے بعد اس کے دماغ کو سکون میسر ہوا۔

اس وقت وہ سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ "فریدہ کی شادی میں اطہر کو کو ضرور بلائے گا ـــــ"

دلہن

خدیجہ مستور

خدیجہ مستور

دسمبر ۱۹۲۷ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئی. والد صاحب چونکہ سرکاری ملازم تھے اور آئے دن انھیں تبادلوں سے سامنا رہتا. اس لئے میرا بچپن بہت سے چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں گذرا. اسی دوران میں ابتدائی تعلیم گھر ہی پر رہ کر حاصل کی. آئے دن رنگ برنگے مولویوں اور ماسٹروں سے سابقہ رہتا. بڑی عجیب سی تعلیم ہو رہی تھی. دادا میاں مجھے آٹھ نو سال کی عمر حافظ قرآن دیکھنا چاہتے تھے اور والد صاحب بارہ تیرہ سال کی عمر میں میٹرک پاس کرا دینے کے متمنی. اس پر غضب یہ کہ ہاجرہ مسرور جیسی کند ذہن کا ساتھ (اس زمانے میں ہاجرہ مسرور بڑی کند ذہن تھی) جو پڑھائی سے بچنے کے لئے ہمیشہ کوئی نہ کوئی طوفان اٹھایا کرتی. ویسے تو میں پڑھنے کی شوقین تھی. مگر سارا بگاڑ اسی لڑکی کا پیدا کیا ہوا تھا. نہ خود پڑھتی نہ پڑھنے دیتی اوّل تو پڑھنے کے نام پر بیٹھتی ہی نہ اور جو کبھی مارے باندھے ماسٹر صاحب اور مولوی صاحب سے مڈبھیڑ کرائی جاتی تو ایسی باتیں کرتی کہ خواہ مخواہ پڑھنے سے جی اچاٹ ہو جاتا. ماسٹر صاحب حساب سکھا رہے ہیں اور میں بھی کافی دلچسپی لے رہی ہوں کہ وہ اچانک سوال کرتی ہے. مثلاً. ماسٹر صاحب چینیوں کی ناک کیوں چپٹی ہوتی ہے ——؟ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے آٹھ سال کی عمر میں قرآن پاک

تو ختم کر لیا۔ وہ بھی کئی جلاد قسم کے مولویوں کی مدد سے لیکن ماسٹر صاحبان ہمیشہ تنگ ہی رہے۔ دن میں دو ایک گھنٹے بہ مشکل پڑھنا اور پھر باوجود دھمکائے جانے کے گھر سے بھاگ جانا اور پھر خاک دھول میں بہت سے لڑکے لڑکیوں کو اکٹھا کرکے گلی ڈنڈا اندھا بھینسا، گیٹری اور کبڈی میں سے کوئی کھیل کھیلنا۔ میرے ساتھ کھیلنے والے لڑکے زیادہ تر وہ ہوتے جنھیں "اونچ" قسم کے لوگ "کمینے" کہتے ہیں۔

ہماری اس "ذلیل" طبیعت پر اکثر مرمت بھی کی جاتی اور دوستی کرنے کے لئے والد صاحب کے دوستوں کے بچے پیش کئے جاتے لیکن یہاں تو بقول دادا میاں کے ہماری رگ رگ میں "کمینگی" سرایت کر چکی تھی جبھی تو صاف ستھرے با تہذیب بچوں میں کھیلنے سے بھاگتے اور اگر کبھی وہ "اونچ" بچے زبردستی ہمارے پلے باندھ بھی دیئے جاتے تو ہم اور ہاجرہ مسز صلاح کرکے ایک بڑا عجیب سا کھیل کھیلتے۔ "ڈاکٹر ڈاکٹر" اور اسی وقت سیفٹی پن سے سب بچوں کے انجکشن دینا شروع کر دیتے۔ بس بات کی بات میں وہ سب "مریض" بھلے چنگے ہو کر نظروں سے غائب ہو جاتے۔

ایک دفعہ ایک سپرنٹنڈنٹ (یہ نہیں یاد کہ وہ کس محکمے کے تھے) کے پڑوس میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ ان کا ایک لڑکا ننھا موہن ذرا لنگڑا۔ عمر بھی کوئی بارہ تیرہ سال کی ہوگی جب بھی ہم دونوں کو چڑا رہے ہیں۔ "بھنگیوں کے ساتھ کھیلنے والا بھنگی" "چماروں کے ساتھ کھیلنے والا چمار" ایک دن دوپہر میں ہم نے انھیں پکڑ لیا اور ان کے لنگڑے پاؤں میں بہت سے انجکشن دے ڈالے۔ اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہم دونوں کو والد صاحب نے کتنی سزا دی ——— لیکن یہ تو ہوا کہ موہن ہمیشہ کیلئے چڑانا بھول گئے۔

انھیں دنوں والد صاحب نے ہماری بڑھتی ہوئی شرارتوں کو روکنے کے لیئے

ہمیں اسکول میں داخل کر دیا اور ماسٹر صاحب کو دو وقت پڑھانے پر مقرر کر دیا۔ تاکہ پڑھنے سے اتنی مہلت ہی نہ ملے جو کبڈی وغیرہ کھیلنے کا دھیان آ سکے۔

اتفاق سے یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی اور میں اپنے لئے کہہ سکتی ہوں کہ پڑھنے میں دل لگنے لگا۔ لیکن چند ہی دن بعد ایک نئے فتنے نے سر اٹھایا۔ اور میں اسی طرف کی ہو رہی۔ ہوا یہ کہ میری بڑی بہن (بیگم دُرّانی) نے دو تین کہانیاں لکھ ڈالیں۔ بس پھر کیا تھا گھر میں وہی وہ ہو گئیں۔ جسے دیکھو ان کے لاڈ کر رہا ہے۔ مجھے ذرا یہ بُرا سا لگا اور میں نے سب سے کہنا شروع کر دیا کہ

"بھیا بھلا کیا لکھنی ہیں میرے دماغ میں ہزاروں

پلاٹ ہیں۔ لکھنا چاہوں تو ڈھیر لگا دوں"

میری اس بات کی داد تو خیر کسی نے نہ دی۔ ہاں مذاق خوب اڑایا گیا۔ والد صاحب اور ماموں جان جب بھی اپنے کسی دوست سے میرا تعارف کراتے تو یہ ضرور فرما دیتے کہ "بھئی ہماری اس بیٹی کے دماغ میں ہزاروں پلاٹ بھرے ہیں لکھے تو ڈھیر لگا دے لیکن لکھتی نہیں۔" بس پڑتا ایک قہقہہ اور مجھے اتنا غصہ آتا کہ دکھا دوں ان سب کو لکھ کر ایک ٹھاٹ دار افسانہ۔ لیکن نہ جانے کس وقت کے لئے افسانے لکھنا اٹھا رکھے تھے۔

دسمبر ۱۹۳۷ء میں والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے اپنے بعد ہم تلے اوپر کی چھ بہنوں اور ایک بھائی کے لئے کچھ سرمایہ نہ چھوڑا تھا اس بات کا ملال جس قدر والد مرحوم کے اعزا اور جگری دوستوں کو ہوا تھا اس کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ بعض اعزا نے یہ معلوم ہوتے ہی ہم لوگوں

کی صورت دیکھنے کی قسم کھالی۔ بھلا وہ ہماری روتی صورتیں دیکھتے بھی کیسے۔؟ غم سے ان کے کلیجے نہ پھٹ جاتے ——— ؟ دوستوں میں سے کچھ نے یہ سوچ کر کہ ان یتیموں اور بیوہ پر غم کا پہاڑ یوں ہی ٹوٹ پڑا ہے، لاؤ کچھ بوجھ تو ہلکا ہی کر دیں۔ یعنی ہمارے گھر کا تمام فرنیچر تھوڑے ہی دن کے اندر اندر انتہائی ہوشیاری سے اپنے قبضہ میں کر کے آپس میں ایمانداری سے تقسیم کر لیا۔ مصیبتوں پر مصیبتیں پڑنے لگیں۔ باقاعدہ سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا۔

والد صاحب کے انتقال کے چند سال بعد کچھ ہوش سنبھالا تو اپنے کو سخت فکروں میں گھرا پایا۔ میں نے عام لڑکیوں کی طرح کبھی یہ نہ سوچا کہ شادی ہو جائے تو موج کی جائے بس یہ خیال ہر وقت دماغ پر چھایا رہتا کہ مجھے کچھ کرنا چاہئیے۔ کیا کرنا چاہئیے ——— ؟ یہ سمجھ میں نہ آتا۔ جدھر آنکھ اٹھاتی اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا اور کوئی نہ تھا جو اس اندھیرے میں راہ دکھاتا اور میں تھی کہ گھبرا گھبرا کر رہ جاتی یہی حال ہاجرہ مسرور کا تھا ——— آخر میں اور وہ مل کر اندھیرے ہی میں چل پڑے۔ کتابیں اور ہم ——— بس بے تکان پڑھے جانا۔ جو چیز سمجھ میں نہ آتی اس کے سمجھنے کے لئے ایک ایک کی خوشامد کرنا۔ احسانمند ہو کر جھڑکیاں کھائیں۔ بائیں بائیں روئے پھر خود ہی آنسو پونچھے، لیکن پڑھتے رہے، تھوڑے دن ادھر ادھر چلایا، پھر ایک رشتے دار (جن کی لیاقت کا لوہا میں آج بھی مانتی ہوں) نے باقاعدہ ہمارے پڑھانے کا ذمہ لیا اور چند ماہ تک بہت شوق سے پڑھاتے رہے۔ پھر نہ جانے کیوں یکایک ان کی رگ بھی بگڑ گئی۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ انھوں نے ہمیں چند ماہ میں جتنا پڑھایا اور جس قدر اچھی طرح پڑھایا

وہ ہم برسوں محنت کرنے کے بعد پڑھ سکے)

۱۹۴۲ء کے اوائل میں سب سے پہلے ایک مضمون لکھا "عورتیں اور شاعری" اس کے بعد افسانے لکھنے شروع کئے۔ تو عزیزوں نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ لیکن میں نے جیسے ان کی بڑبڑاہٹ سنی ہی نہیں۔ اور لکھتی رہی ــــــ بڑبڑاہٹ نے بڑھتے بڑھتے ڈانٹ پھٹکار کی صورت اختیار کر لی۔ اور پھر جتنے ظلم کئے گئے وہ بجائے خود ایک داستان ہے ـــ لیکن نتیجہ کیا ہوا ـــــ؟

"اللہ! بھائی جان یہ دیکھئے اس میں ــــــــــ" مارے خوشی کے میں بات پوری نہ کر سکی اور رسالہ ان کی طرف بڑھا دیا۔

"اوہ! یہ تو کوئی نیا رسالہ آیا ہے، شاید اس میں میری نظم ہو گی۔ میں نے تو بھیجی بھی نہ تھی نقل ...."

"ارے بھائی جان! یہ آپ کے نام نہیں، میرے نام آیا ہے! اس میں میرا ــــــــــ"

"کچھ دماغ خراب ہو گیا ہے تمھارا، تم ہو بھی کہیں کی بڑی ادیبہ جو رسالے تمھارے نام آنے لگے"!

"آپ تو سنتے بھی نہیں بات! میں نے ایک افسانہ لکھا تھا اور پھر چھپنے کے لیے بھیج دیا۔ دیکھئے کیسی شان سے شائع ہوا ہے"

"اوہ!" انھوں نے جلدی جلدی رسالے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر کھڑے کھڑے میرا افسانہ پڑھنے لگے۔ میرا یہ عالم کہ دل خوشی سے دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور دل چاہ رہا تھا کہ بس یہ جلدی سے پڑھ کر ختم کریں اور پھر مجھے شاباش دیں کہ واقعی تم نے خوب لکھا شہلا! پہلے ہی افسانے میں اس قدر ترقی۔ کتنا انوکھا خیال پیش کیا ہے اور ————

"لاحول ولاقوۃ! کیا لکھا ہے تم نے، نرا گدھاپن کیا ہے! ایک شریف گھرانے کے لڑکے کو تم نے مہترانی سے چھیڑچھاڑ کرتے دکھا دیا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟"

انھوں نے رسالہ میز پر پھینک دیا۔

"خوب! میں سچ کہتی ہوں بھائی جان! کہ یہ سب جو لکھا ہے چھپ چھپ کر خوب خوب ہوتا ہے۔ یقین کیجئے کل میں نے آپ کے دوست ہیں نا وسیم، ان کو دیکھا کہ جب میرے گھر سے مہترانی کی لڑکی نکلی تو انھوں نے اس کو چھیڑا اور جب وہ ہنستی ہوئی جانے لگی تو آہستہ سے گانے لگے "وگوری دھیرے چلو جوبن چھلک نہ جائے" وہ تو میں جب بھی دروازے پر کھڑی ہوتی ہوں تو ان کو اپنی بیٹھک میں بیٹھے ہر آنے جانے والی عورت کو دیکھ دیکھ کر ہنستے ہی پاتی ہوں! بس آپ کے سامنے جو وہ شریف بنے رہتے ہیں تو آپ نے سمجھ لیا کہ بڑے اچھے ہیں۔"

"بکواس کرتی ہو تم؟ کبھی اس سے پہلے نہ کہی یہ بات، اب افسانے لکھنے کیا شروع کئے کہ جھوٹ بھی ترقی کر گیا۔"

"جی آپ کو تو ہماری ہر بات بکواس معلوم ہوتی ہے!" میں نے رنجیدہ ہو کر سر جھکا دیا۔ کتنے ارمان سے تو اپنا افسانہ پڑھنے کو دیا۔ اس کی یہ قدر ہوئی۔ بچھوٹے

منہ سے ایک لفظ تعریف کا نہ نکلا یہ بیٹھ گئیں منہ لٹکا کے! جیسے میں نے گولی مار دی تھا اُسے! افسانہ لکھنے کے بعد فوراً ہی حساس بھی ہو گئی غریب!"

"ارے میں کہتی ہوں کہ آخر یہ تم دونوں لڑا کیوں کرتے ہو؟" اماں نے دالان میں سے چیخ کر کہا۔

"جی! میں لڑ نہیں رہا ہوں! یہ آپ کی صاحبزادی پر افسانہ نگاری کا بھوت سوار ہے" بھائی جان نے دالان کی طرف بڑھتے ہوئے طنزیہ کہا۔ اور اماں پیشانی پر ہاتھ مار کر اور زور سے پنکھا جھلنے لگیں۔

"اب خدا ہی حافظ ہے اس گھر کا صاحبزادے خیر سے پہلے ہی ادیب و شاعر تھے اب بیٹی کو بھی افسانہ نگاری کی لت لگ گئی" اماں نے بڑی رقت سے کہا جیسے میں نے افسانہ لکھ کر کوئی ثقیل گناہ کیا ہے۔ جب بھائی جان نے پہلے پہل نظم کہی تھی تو سب کتنے خوش ہوئے تھے اور میری یہ گت!

"کان کھول کر سن لو شہلا اگر تم نے گھر کے کام میں ذرا بھی کسر مسر کی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ جیسے تمہارے بھائی جان کی ملازمت کے نام سے جان نکلتی ہے یہ حال نہ ہو تمہارا اب!" اماں نے کھرّے پلنگ پر لیٹ کر پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا" اور سن لو کہ چائے میں اس کھوسٹ رحیمن کے ہاتھوں کی نہ پیوں گا، وہ بالکل خراب چائے بناتی ہے۔ اب تم مجھے دونوں وقت بنا کر دو گی۔ ورنہ ہاں —— وہ افسانہ نگار جو ہو گئی ہو تو کھوئی کھوئی نہ پھرنا" وہ کچھ بگڑے سے کرسی پر بیٹھ گئے۔

"یہ تو آپ کی زیادتی ہے بھائی جان! آخر آپ پہلے رحیمن کے ہاتھ کی

بنی ہوئی چائے پیتے تھے یا نہیں ——— ؟ میں نے تو ناحق آپ کو اپنا افسانہ دکھایا جو پا پڑ ہاں لگ گئیں، واہ کیا قدر کی میرے لکھے کی۔ وہ دوسری لڑکیوں کے ذیلنے ذتیل سے افسانے پڑھ کر کیسی تعریفیں کرتے ہیں۔"

"اگر تم کچھ لکھو تو پھر واقعی تعریف بھی ہو، فضول سے افسانے کی کون تعریف کرے۔"

خیر ہو گا فضول، میں آپ کو چائے بنا کر دیدیا کروں گی باقی آپ کو مجھ سے کوئی غرض نہ ہونا چاہیئے۔

"ہاں مجھے کیا غرض، لیکن یہ بتائے دیتا ہوں کہ ترقی ورقی تم کرنے سے رہیں، پہلا ہی افسانہ پڑھ کر سب معلوم ہو گیا!"

"اور آپ کی کون بڑی شہرت ہے۔"

"ہے کیوں نہیں، خدا کی قسم۔ تمام اچھے لکھنے والوں میں پہلا نمبر ہے۔"

میرا! وہ جوش سے کھڑے ہو گئے۔

"تو میرا ابھی کبھی نام ہو جائے گا۔"

"بس ہو چکا!" ——— وہ پھر بیٹھ گئے۔

"اچھا خیر! ——— میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔ آخر بھائی جان کو کیا ہو گیا ہے۔ انھیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ ان کی ہونہار بہن ان کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ نہ کہ مجھ سے نپٹنے لگے، ابھی ایک سا ہی افسانہ لکھا ہے اور پیشین گوئی کر دی کہ میں ترقی کرنے سے رہی، اونھ! دکھا دوں گی ان کو کہ میں کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ ابھی

وہ اپنی بہن کی صلاحیتوں کو سمجھے ہی نہیں۔ ورنہ یہ کبھی نہ کہتے۔

ایک، دو، تین، برابر لکھے گئی اور ایک سال کے اندر اندر بارہ بہترین افسانے لکھ ڈالے اور سب کے سب معیاری رسائل میں شائع ہوئے۔ ادبی دنیا سے دلچسپی رکھنے والوں میں دھوم مچ گئی، روز تعریفی خطوط آنے لگے۔ ایک دن میں نے فخر سے بھائی جان کو اپنے کارنامے دکھائے۔ وہ بھی ایسی حالت میں جبکہ پہلے ہی سے خوش نظر آرہے تھے۔

"دیکھئے یہ سب! ویسے تو بقول آپ کے میں ترقی کرنے سے رہی" میں نے چند رسالے اور خطوط ان کے سامنے رکھ دیئے۔

"اب تم دکھا رہی ہو تو دیکھ لیتا ہوں" انھوں نے ایک قہقہہ لگایا اور خطوط پڑھنے لگے۔ کہاں تو ایسے خوش تھے لیکن خطوط دیکھ کر چہرہ پھیکا سا ہو گیا پھر انھوں نے ایک افسانہ پڑھا اور بڑے فکر مند سے ہو گئے۔ لو بھلا یہ خوش ہونے کے بجائے فکر کیسی —— میرا دل دھڑکنے لگا کہ اب دیکھیں کہ سال بھر کی محنت کا کیا صلہ ملتا ہے۔

"ہاں بس کچھ چل نکلی ہو" —— انھوں نے تھکے سے لہجے میں کہا۔

"جی! چل نکلی ہوں!" —— مجھے غصہ آگیا۔

"نہیں تو کیا بڑی مشہور ہو گئی ہو؟" —— انھوں نے میرے رسالے میری طرف بڑھا دیئے۔"

آپ یہ کیوں نہیں مانتے کہ اب آپ کے برابر میری شہرت بھی ہو گئی

ہے؟" میں رسالے سمیٹنے لگی۔

"اوہ! یہ زعم؟ تم مر بھی مٹو جب بھی میرے برابر نہیں پہنچ سکتیں۔"

"جی تو ذرا آپ اپنے کسی افسانے پر ایسا نوٹ دکھائیے جیسا میرے افسانے پر لکھا ہے۔"

"ایک کیا ہزار ——— وہ جوش سے کھڑے ہو گئے اور الماری سے تمام رسالوں کی فائلیں نکال کر زمین پر پھینکدیں اور لگے اپنے افسانے ڈھونڈنے مجھے ہنسی آئی جا رہی تھی۔ میں نے تقریباً ان کے سب افسانے دیکھے تھے اور اچھی طرح جانتی تھی کہ حضرت کے ایک افسانے پر بھی ایسا نوٹ نہیں لکھا گیا ہے۔

"یہ دیکھو ———" انھوں نے ایک افسانہ میرے سامنے کر دیا۔

"اور یہ دیکھئے میں نے اپنا افسانہ بالکل ان کی آنکھوں سے لگا دیا نہ جھنجھلا گئے۔ اور پھر لگے فائلیں الٹنے پلٹنے۔ میں خاموش کھڑی ان کا جوش دیکھ رہی تھی۔

"اب نکال بھی چکئے۔ ایک کیا ہزار ہیں آپ کے پاس؟" میں نے انھیں تپایا۔

"نہیں نکالتا۔ بڑی آئیں حکومت کرنے والی ——— نامعقول۔"

وہ فائلیں سمیٹ کر الماری میں رکھنے لگے

"یہ اچھی رہی۔ کیا خوب آپنے اپنے کو بال بال بچایا۔"

"بچایا کیا؟ تمھاری جیسے نومشق سے میرا کیا مقابلہ؟"

"بے شک میرا آپ کا کیا مقابلہ۔" میں نے اقبال کر لیا کیونکہ انکی صورت بالکل اتری ہوئی تھی۔ میں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ بھائی جان میری تعریف کیوں نہیں کر سکتے۔ دن بھر وہ منہ پھلائے رہے اور مجھ سے بات نہ کی۔

"اماں! یہ منع کرو شہلا کی بچی کو۔" بھائی جان کی دھیمی سی آواز میرے کمرہ تک پہنچ ہی گئی۔ اور میں کتاب رکھ کر گن سوئے لینے لگی۔

"کیا ہوا آخر؟" اماں نے پوچھا۔

ہوا کیا؟ دو چار افسانے کیا لکھ لئے کہ ہر وقت مقابلہ پر آیا کرتی ہے۔ آج کل لکھ جو رہی ہے نا اور مجھے فرصت ہی نہیں ملتی ورنہ دکھا دوں۔ کہ بھلا تم کیا لکھو گی میری جیسی رفتار سے۔ اور پھر سوچتا ہوں کہ میرے ضرورت ہی کیا ہے بھلا۔ ایسی دائمی شہرت حاصل کر لی ہے کہ اسے نصیب بھی نہیں ہو سکتی ہے۔" ان کی آواز غصے سے بھرائی۔ اور اماں کی ہولے ہولے ہنسنے کی آواز آئی۔

اے ہٹو بھی نجم تم بھی کیا بہن سے خار کھاتے ہو" اماں نے جلے پر نمک چھڑکا۔ اور مجھے آئی ہنسی۔ جلدی سے ہٹ گئی۔ کہ کہیں بھائی جان کو خبر ہو گئی تو سارا غصہ مجھ پر اتریگا۔ اوہ، ہم سگے بہن بھائی اور شہرت کے معاملے میں یہ دشمنی؟ مجھے کچھ رنج سا ہونے لگا۔ اور پھر میں نے بھی سوچ لیا کہ اب ان کو اچھی طرح بنایا جائیگا اس کے بعد میں نے اور بھی انہماک سے لکھنا شروع کیا۔ بھائی جان دیکھتے اور ہونٹ کاٹتے۔

"کھانا بد مزہ ہوتا ہے۔ افسانہ نگار صاحبہ کو فرصت ہی کب ہے جو ترچمین کے کام میں مدد دی جائے۔" وہ کھانے میں طرح طرح کے عیب نکالتے ہوئے کہتے۔

"چائے جوشاندہ معلوم ہوتی ہے" وہ کپ توڑنے کے انداز سے پٹخ کر کہتے۔ میں سب باتوں کا جواب ایک مسکراہٹ سے دیتی۔

چند دن بعد میں نے محسوس کیا کہ اب میرے نام خطوط کا انبار آنا بتدریج کم ہوتا جا رہا ہے۔ رسالے بھی غائب ہو رہے ہیں۔ میں گھبرا گھبرا کر

ایڈیٹروں کو خط لکھتی مگر جواب غائب۔ اور چند ماہ بعد تو خطوط اور رسائل آنا قطعی بند ہو گئے۔ اور میں نے مایوس ہو کر لکھنا بند کر دیا۔ اور سمجھ لیا کہ یہ سب میرے غرور کا نتیجہ ہے۔ یا پھر اب میرے افسانوں میں وہ بات ہی نہیں ہوتی جو کوئی قدر کرے۔ بھائی جان نے مجھے کئی دفعہ چھیڑا اور کہو بھئی کیسا حال ہے۔ خوب چپکے چپکے ترقی کی جا رہی ہے۔ اب تو ہمیں شریک کرنا بھی گوارا نہیں۔ بھئی اب وہ تمھارے رسالے آنا کیوں بند ہو گئے۔؟ خیر آتے بھی ہوں تو اب ہمیں کیوں دکھاؤ گی؟"

میں خاموشی سے ان باتوں کو سنتی۔ اور کبھی کبھی چھپ کر رو لیا کرتی. کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا ورنہ یہ بھائی جان۔ یوں میرے سر چڑھتے چار دن کے لئے بھائی جان باہر گئے ہوئے تھے۔ اماں بھی محلے میں جا بیٹھیں۔ تنہائی میں دل جو ذرا وہ گھبرایا تو دیوان خانے میں جا کر بھائی جان کی میز کی درازیں کھولنے بند کرنے لگی۔ اور یہ دیکھ کر ایک دم اُچھل پڑی کہ ایک دراز میں میرے وہ تمام خطوط جو گھبرا گھبرا کر ایڈیٹروں کو لکھے گئے تھے بحفاظت رکھے ہوئے تھے" اوہ یہ بات ہے۔ وہی تو میں کہوں کہ کیا ہو گیا۔" مجھے ایک بار پھر اپنے اوپر غرور کرنے میں مزہ آنے لگا۔ اور تو اور بہت سے ایسے خطوط بھی ملے جو ایڈیٹروں نے میری خاموشی سے گھبرا کر لکھے تھے۔ بھائی جان کی چوری پکڑ کر غصے کے ساتھ ساتھ خوشی بھی بہت ہوئی. غصہ تو یوں آیا کہ دیکھو خواہ مخواہ ہی تو مجھے اتنے دن دنیائے ادب سے گم کر دیا۔ اور خوشی اس لیے ہوئی

کہ دیکھو اب کیسا سمجھتی ہوں بھائی جان سے خدا کی قسم مارے طعنوں کے ان کا کلیجہ چھلنی نہ کر دیا ہو تو نام نہیں۔ اب تو جیسے ایک دم مجھ میں شان سی آگئی اور بھائی جان کا خوف دل سے نکل گیا۔

جب کوئی اپنے سے بڑے کی چوری پکڑتا ہے تو یہ ہی حالت ہوتی ہے۔ اونھ، کوئی ہمارا کیا بنائے گا۔ وہ خود ہی چور ہیں۔ اور میں نے ان کی میز پر پڑی ہوئی صبح کی ڈاک کا معائنہ شروع کر دیا۔ یہ لفافہ۔ بھئی نہیں کھولنا چاہئے۔ ذرا بُری سی بات ہے۔ تو پھر یہ رسالہ کھول کر پڑھنا چاہیئے۔ اور میں نے رسالہ کھول کر الٹنا پلٹنا شروع کر دیا۔ رسالے کے پانچویں ہی صفحہ پر بھائی جان کا ایک افسانہ مع ایک نوٹ کے شائع ہوا تھا۔ خوب تو گویا اب بھائی جان کے افسانوں پر بھی نوٹ شائع ہونے لگے۔ مجھے کچھ جلن سی ہوئی خبر پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔

"جناب نجم الحسن صاحب ایک بہترین شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔ ناظرین کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ گزشتہ ایک سال سے جو افسانے "شہلا" کے نام سے شائع ہوتے رہے ہیں اور جن کی دھوم سارے ملک میں ہے وہ بھی دراصل نجم صاحب کے قلم کا اعجاز تھے۔ اس حقیقت کا انکشاف آپ نے اپنے ایک دلچسپ خط کے ذریعہ فرمایا ہے۔ ہم جناب نجم الحسن صاحب کو اس "حسین دھوکے بازی" پر مبارکباد پیش کرتے ہیں ــــــــــ"

آنکھوں کے سامنے حروف ناچنے لگے اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے مجھے چکر دے کر اب ایک دم چھوڑ دیا ہے۔ دیکھا! اسے کہتے ہیں دن دہاڑے سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لوٹ لینا۔ جی میں آیا بس خودکشی کر لوں لیکن ——

آزادی

حمیدہ سلطانہ

حمیدہ سلطانہ

آپ نے فرمایا ہے کہ میں اپنے حالات زندگی بھی لکھوں، حالانکہ میرے حالات زندگی کوئی خاص نہیں ہیں ایسے ہی ہیں جیسے عام طور پر شریف مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے اور میرا یہ کہنا تعلّی نہیں حقیقت ہے کہ میں نے افسانوی ماحول میں پرورش پائی ہے میرے لڑکپن کے کئی ساتھیوں کی زندگی جن میں لڑکے بھی ہیں اور لڑکیاں بھی بجائے خود افسانہ ہیں۔ ادبی ذوق مجھے ننہال سے ترکہ میں ملا ہے۔ میری والدہ نواب زین العابدین خاں عارف مرحوم کی پوتی اور نواب ضیاءالدین احمد خاں نیّر رخشاں کی نواسی ہیں "عارف" وہی عارف ہیں جن کیلئے "مرزا غالب" نے لکھا ہے ع

"ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف"

میرے ابّا جان لفٹیننٹ کرنل ذوالنور علی احمد گوہاٹی (آسام) کے باشندے تھے لیکن دلّی کی شاعرانہ فضا کے دل سے قدردان۔ غالب، مومن کی سرزمین سے ان کو دلی لگاؤ تھا۔ اسی لگاؤ کا نتیجہ والدہ کی اور ان کی شادی تھا اردو کے ساتھ ساتھ ابّا جان کو فارسی سے بھی عشق تھا مجھے فارسی کی تعلیم انھوں نے خاص اہتمام سے دلوائی۔ دیوان حافظ ہمیشہ ان کے سرہانے

رہتا تھا اور اکثر دیوان حافظ کے اشعار وہ پڑھتے رہتے تھے۔

پرانے شریف خاندانوں کی طرح ہمارے خاندان میں بھی اب سے بیس سال قبل لڑکیوں کا اسکول بھیجنا معیوب سمجھا جاتا تھا اس لئے میں نے بھی اپنی دونوں بڑی بہنوں کی طرح گھر پر ہی اردو فارسی اور انگریزی کی تعلیم پائی. اور اس طرح جو کچھ بھی سیکھا وہ اتنا ہے کہ میں فارسی اور انگریزی دونوں زبانوں کے ادب کو سمجھ سکتی ہوں. میری تحریروں پر دونوں زبانوں کا اثر کافی ہے۔ سوچنے کی عادت مجھے لڑکپن سے ہے. اور لڑکیوں کی طرح میں نے گڑیاں کبھی نہیں کھیلیں. کھیلنے کے اوقات میں بھی اکثر کہانیوں کی کتابیں یا اخبار پڑھتی رہتی تھی۔

بارہ سال کی عمر میں فارسی بخوبی لکھ پڑھ اور بول سکتی تھی مشاعرہ کرنے کا مجھے بچپن سے شوق تھا اپنے ہم عمر خاندان کے لڑکے اور لڑکیوں کو جمع کر کے مشاعرہ کرتی تھی اور کبھی کبھی ادبی مباحثہ بھی. اسی مقصد کیلئے ایک انجمن بھی بنائی تھی. سولہ سال کی عمر میں ایک معاشرتی ناول "ثروت آرا" بھی لکھا. وہ مکمل نہ ہونے پایا تھا کہ ابّا جان بیمار ہوئے اور چار ماہ کی سخت علالت کے بعد اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے ان کے انتقال نے میرے خرمن ہوش و حواس پر بجلی گرا دی۔ رفتہ رفتہ دل سنبھلا۔ مگر تعلیمی مصروفیت نے ادبی کاموں کو خیرباد کہنے پر مجبور کیا. پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان دیا. اس کے بعد ادیب فاضل کیا اور ۴۳ء سے تکمیل تعلیم کے بعد میں نے پھر لکھنے کی جانب توجہ کی سب سے قبل "ثروت آرا"

کی تکمیل کر کے اس کو چھپوایا۔ اس کے بعد سے مرزا غالب کی زندگی کے حالات ترتیب دے رہی ہوں لیکن بقول غالب ؎

"اک سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے"

میں ہمیشہ جو کچھ لکھتی ہوں پہلے اپنے لئے لکھتی ہوں۔ دوسروں کی پرواہ نہیں کرتی اور میرے افسانے محض افسانے ہی نہیں ہوتے ان میں سے اکثر سامنے گزرے ہوئے واقعات کا دھندلا سا عکس ہیں۔ جب کوئی خاص واقعہ میرے دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے تو افسانہ تیار ہو جاتا ہے بغیر کسی تحریک کے میں افسانہ نہیں لکھ سکتی، دور از کار رومانی قصے، عشق و محبت کی فرضی داستانیں میرے قلم سے کبھی نہیں نکلتیں۔

ایک برفانی صبح تھی، گو دن کے دس بج چکے تھے۔ لیکن آسمان پہ گہرا ابر چھایا ہوا تھا۔ ٹھٹھرا دینے والی سرد ہوائیں ابھی تک چل رہی تھیں۔ سردی سے اعضا اکڑے جا رہے تھے۔ اس لئے میں نے کرسی آتشدان کے قریب کھینچ لی۔ اور خیالوں میں کھو گئی۔ ساون کی رم جھم گہرے بادلوں کی موجودگی اور خاص کر جاڑوں میں تنہائی میں تیز آگ کا جلنا تخیل کو تیز اور واہمہ آفریں کر ہی دیتا ہے۔ میرا دماغ مکمل نامکمل، نحیف، قوی، اور طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا آتشدان میں نہ جانے کیا شعریت ہے کہ انسانی دماغ میں تخیلات کا ایک اتھاہ سمندر موجزن ہو جاتا ہے۔ اسی کاروان تخیل میں یکایک میرے دماغ میں ایک خیال اس طرح آ کر رکا جیسے سڑک سے کٹ کر کوئی راہ گیر کھڑا ہو جائے۔ اور اس خیال نے دوسرے

خیالوں کی ساری بھیڑ چھانٹ دی۔

اسی حلقۂ خیال میں گزری ہوئی شام تھی، ایک سیاسی کارکن تھے میں بھی اور آزادی کے مسئلے پر گرما گرم بحث۔

"میں آپ سے کہتا ہوں کہ سیاسی رہنماؤں کا اچھوتوں کے ساتھ میل جول صدیوں کی دوری کو ختم کر سکتا ہے، سماج کی بندشیں رفتہ رفتہ کمزور ہو کر بالکل ڈھیلی پڑ جائیں گی۔ خاص طبقوں کے خاص افراد کا اچھوتوں کے قریب ہونا اس بات کی ترغیب ہو گا کہ دوسرے خاص اور چھوت چھات کرنے والے اپنی فطرت کو نرم کریں۔"

"یہ ایک حد تک درست ہو سکتا ہے۔ لیکن جب تک آپ سسٹم تبدیل نہ کریں اس وقت تک یہ تبدیلی کیوں کر ہو سکتی ہے۔!؟

سرمایہ دارانہ نظام میں جو امیرانہ تمدن چل رہا ہے، اس تمدن نے امیر و غریب چھوٹے اور بڑے، بھوکوں اور پیٹ بھروں کے درمیان جو شدید تقسیم کی ہے اور جو گھناؤنی حالت پیدا کر دی ہے محض جادو کی چھڑی سے تو آپ اسے نہیں بدل سکتے۔"

اس نظام کا ہلا دینا آسان کام نہیں، بچپن ہی سے اونچ نیچ کا فرق ذات پات کی بندشیں اور اس مایوسانہ زنجیروں میں مذہبی تخیل سے پرفریب آسرا دماغوں کو ایک ماحول کے اثرات سے رچا دیتا ہے۔

ایک بچے کو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی دھرم اور رسم و رواج کا پورا پورا احساس کرا دیا جاتا ہے اور "قسمت" و بھاگ کے ہمت شکن بندھنوں کے

اندر وہ پروان چڑھتا ہے، آنکھ جو کھلتی ہے تو انسانیت ماحول کے مطابق کھنگی ہوتی ہے یا چمار، مالی ہوتی ہے یا کسان، مزدور ہوتی ہے یا اور کوئی!؟

اقتصادی لوٹ کھسوٹ نے طبقاتی تقسیم کی ہے اور طبقاتی تقسیم نے انسانی ترقی کو صدیوں سے روک دیا ہے۔

جب تک آپ سماجی آزادی ملک میں پیدا نہ کریں اس وقت تک ملکی آزادی کیوں کر آسکتی ہے!؟

"آپ ایک زاویہ نگاہ سے بحث کر رہی ہیں!؟"

"دو زاویہ نگاہ سے تو بحث آپ ہی کر سکتے ہیں"

میرا مطلب یہ ہے کہ ——————

آپ کا مطلب کیا ہے —————— یعنی جو دلائل میں نے پیش کئے وہ لچر ہیں۔ کیا یہ غلط ہے کہ جب تک سسٹم تبدیل نہ ہوگا آپ ملک میں آزادی، امن اور مسرت پیدا نہیں کر سکتے۔ فرض کیجئے کہ ایک ایسی جمہوریت قائم کرنے میں آپ کامیاب ہوگئے جو یہاں کے سرمایہ دار اور راجاؤں اور نوابوں کے طبقہ پر مشتمل ہوئی تو آپ جماعہ ۳۰ کروڑ ہندوستانیوں کو کیوں کر ایک سطح پر لاسکیں گے!؟

"مگر ہوگا یہی کہ پہلے ہندوستان کو سرمایہ داری کی تکمیل کرنی ہوگی پھر امپیریلزم کی اس کے بعد صحیح جمہوریت ملک میں پیدا ہوگی ——!؟

تو پھر آپ یوں کہئے کہ آپ سرمایہ داری کے نمائندے ہیں اور ساری قومی جدوجہد آپ کے بیان کے مطابق اس وقت آزادی کیلئے

نہیں امپیریلزم کے لئے ہے ؟"

"جی نہیں. میرا مقصد یہ ہے کہ نظام کے طور پر ہر ملک کو ان مدارج سے گزرنا پڑتا ہی ہے مثلاً ۔"

"مثالوں سے مجھے چڑ ہے، ہاں خود بھی کوئی مثال نہیں دوں گی ایک طرف آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے طبقۂ بالادست سے حکومت چھین کر ہندوستانی طبقۂ بالادست کے ہاتھوں میں دینا چاہتے ہیں اور دوسری طرف کسانوں، مزدوروں اور اچھوتوں کی ترقی اور فلاح چاہتے ہیں۔ اچھوتوں کو شرفا کی برابری کرنے میں زمین و آسمان ایک کئے دے رہے ہیں۔ مذہب کو ڈھکوسلا بتا رہے ہیں اور ہندوستانی سماج ہے کہ اس کی مشینری کی ایک کل سیدھی نہیں، غلامی اور فرسودگی کا ایک سست رفتار چرخہ دوریاں ہزار اور چکر گھنٹوں میں دو تین، ! ؟

رسم ورواج کے وہ بندھن کہ خدا کی پناہ، شادی جیسے اہم مسئلہ پر کسی کو غور و فیصلہ کا حق نہیں۔ یہاں شاید ہی کوئی شخص حسب مرضی شادی کر سکتا ہو، بیچاری عورتیں، سو ان کو تو بولنے کا بھی حق نہیں۔ ان کا لب کھولنا گناہ عظیم ہے۔ رہے مرد، سو اُن کو بھی کیوں دوش دوں ! ؟۔ وہ بھی ذات پات کی بندشوں، طبقاتی اور خاندانی بڑائی اور پستی، اور سب سے زیادہ اقتصادی حیثیت کی کمی و بیشی خوش حالی و بدحالی کی وجہ سے اپنی مرضی کے مطابق شادیاں کرنے میں برائے نام ہی کامیاب ہیں. سماج میں انسان اور انسانیت کی کوئی حیثیت نہیں. اس کی خوشنودی کیلئے سرمایہ دار ہونا

ضروری ہے۔ حیوان نما انسان کی پشت پر اگر سونا کھنک رہا ہے تو بلا تامل اس کو سر آنکھوں پر لیا جاتا ہے۔ لیکن وہ غریب جو سرمایہ دار نہیں مگر اخلاقی خوبیوں کی دولت رکھتا ہے، بلند فطرت انسان ہے، اگر اقتصادی لحاظ سے سوسائٹی میں نمایاں حیثیت نہیں رکھتا تو پھر وہ دیوتا ہی کیوں نہ ہو منہ لگانے کے قابل بھی قابل نہیں۔ سماج کے نزدیک سب سے بڑا نقص غربت ہے اور سچ ہے غربت ہی سب سے بڑا نقص ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نظام تمدن کے ہوتے ہوئے ہندوستان آزاد ہونے کی خواہش کیسے کر سکتا ہے؟ قدم قدم پر فرسودہ معاشرت نفس نفس میں رسم و رواج کی زنجیریں۔ یہ بندھن اتنا سخت ہے کہ باوجود مغربی نقالی کے وہ آزادی، جو انسان کو انسان کہلانے کا مستحق بنا دیتی ہے ہندوستان کو آزاد ہو کر بھی حاصل نہیں ہو گی۔"

ہمارے دل و دماغ پر غلامی کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ ہم چاہیں بھی تو اپنے ماحول سے بغاوت نہیں کر سکتے۔ ان زنجیروں کو جو ہمیں جکڑے ہوئے ہیں ڈھیلا کرنے کی کوشش ہم کو قابل نفرت بنا دیتی ہے، اچھوت سدھار اور سب کو ایک نظر دیکھنے کا خیال خام ہے۔

تمام ہندوستان ذات پات، اونچ نیچ کی لعنت میں گرفتار ہے ذہنیتیں بالکل تباہ ہو چکی ہیں۔ آزادی کا درخت بالکل کھوکھلا ہے۔ اس کی جڑیں دیمک لگی ہوئی ہے۔

اوپری باتوں سے فائدہ نہیں آپ لوگ اصل مرض کا علاج نہیں کرتے۔

جس ملک میں ذرا ذرا سی انسانی کمزوریوں کو معاف نہیں کیا جاتا ہو جہاں شادی کو بھی تجارت سمجھ کر جہیز و مہر کا سودا چکایا جاتا ہو جس ملک میں نوجوان دلوں کو مرضی کے خلاف کچل کر رکھ دیا جاتا ہو، اور جہاں بچپن سے ہی جذبات کی کلیوں کو مرجھا کے رکھ دیا جائے وہ خاک ترقی کرے گا۔ حقائق پر تخیل کے رنگین نقاب ڈالنے سے کیا حاصل ؟

"میں سمجھا آپ ملکی آزادی سے پہلے سماجی آزادی کی تکمیل چاہتی ہیں ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔"

ان کے لبوں پر پھیکی سی ہنسی آئی "آپ بہت متاثر معلوم ہوتی ہیں۔"

"جی نہیں متاثر نہیں، از سرتاپا سلگ رہی ہوں۔"

"مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے۔"

چاہیئے بھی۔

بہت اچھا، میں رخصت ہوتا ہوں، پھر تبادلہ خیال ہوگا۔"

یہ کہا اور چلے گئے۔

میرے حلقۂ خیال میں سورج کی ایک کرن نے داخل ہو کر اس کو تار عنکبوت کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ میں نے ایک لمبا سانس کھینچا اور دریچہ کھول دیا۔

۲

آسمان کی سنہری کرنوں نے کمرے کو منور کر دیا۔ ساتھ ہی میرے کانوں میں زیبی کی آواز آئی۔ یہ میری چھوٹی شریر بھانجی ہے چار سالہ ننھی فریبا کا اس کا پورا نام تو زاہدہ ہے لیکن میں اس کو پیار سے زیبی ہی کہتی ہوں۔ مجھے

اس کی معصوم شرارت بہت عزیز ہے میں نے دریچے سے باہر جھانکا۔ زبیدی سرخ گرم فراک اور گرم کوٹ پہنے ہوئے گیندے کے پھولوں کے قریب کھڑی تھی اس کے بال ہوا سے بکھر گئے تھے۔ چہرے پر شوخی و خوشی کا نور تھا۔ وہ تتلی پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سامنے کچھ فاصلے پر مہترانی کا چھ سالہ بچہ منّو شوق کی نظروں سے تتلی کو گھور رہا تھا۔ شاید اس کے ننھے دل میں بھی اس کو تتلی پکڑنے کا شوق تھا۔ لیکن غریب کو شروع سے اپنی تمناؤں کو دل میں دفن کر دینے کا سبق دیا گیا تھا۔ اس لئے دور ہی سے بولا "بے بی اس طرح نہیں یوں تو وہ اڑ جائے گی دھیرے دھیرے اس کے پاس جاؤ" منّو کی آواز سے طفلانہ شوق ٹپک رہا تھا۔

زبیدی منّو کی ہدایت پر عمل کرنے کے لئے رک گئی۔ اور تتلا کر کہا میلے پاچ (میرے پاس) آکر تبا منّو تتلی کیوں کر پکلوں (پکڑوں)

منّو قریب آ گیا۔ زبیدی کے بلانے سے خوشی کے مارے اسکی باچھیں کھلی پڑتی تھیں۔ گویا قارون کا خزانہ مل گیا تھا۔ میں دیکھ رہی تھی۔ اللہ رے فرق۔ دونوں بچے تھے۔ معصوم لڑکپن دونوں ہی کا تھا۔ لیکن ایک صاف ستھری قوم کے لحاظ سے آرام دہ لباس میں ملبوس بچپن کی تازگی کا نور رخساروں میں لئے ہوئے ہنسی کی بولتی چالتی گڑیا۔ دوسرا غریب اس قیامت کی سردی میں کثیف پھٹا ہوا کرتا اور نہایت پرانا سویٹر پہنے ہوئے ٹانگوں سے ننگا۔ میلا۔ کچیلا، دبلا، نیلا، فاقہ زدہ، سہما ہوا۔

باوجود منّو اور زبیدی کی کوشش کے تتلی اڑ گئی، ان کے ہاتھ نہ

آئی۔ تلافیٔ شکست کے طور پر زاہدی نے پھول توڑنے شروع کر دیئے اور ایک پھول منّو کو دے کر بولی۔ لے تو اپنے گھر میں لگائیو۔

میں ہنس پڑی اور ہنسی کی آواز سے چونک کر زاہدی نے مجھ کو دیکھا کچھ دیر تو وہ سہمی کھڑی رہی لیکن پھر بھاگ گئی گویا اُس کو خوف تھا کہ میں اس غریب بچے کے ساتھ کھیلنے سے اُس پر ناراض ہوں گی۔

اُدھر منّو نے ہاتھ جوڑ کر التجا آمیز لہجہ میں کہا۔ "بیگم جی پھول میں نے نہیں لیا بے بی نے دیا ہے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ ڈر نہیں منّو! اور پھول لے گا۔

منّو ابھی جواب نہ دینے پایا تھا کہ اس کی بڑی بہن باکو نے آ کر اُس کے گال پر ایک طمانچہ رسید کیا اور چیخ کر بولی۔ کیوں رے تو یہاں کھیل رہا ہے۔ میں نے کہا تھا کیاری صاف کر دے کام کرتے تو موت آتی ہے بے چارا منّو تھپڑ کھا کر روتا ہوا گیندے کو پھول کو سینے سے لگائے کیاری کی طرف چلا گیا۔

میں نے باکو سے کہا۔ اری تو بڑی ظالم ہے کیوں مارا بیچارے کو، بچہ ہی تو ہے !؟ کھیلنے دیا ہوتا۔

باکو سرد آہ بھر کر بولی۔ بیگم جی یہ سب امیروں کی باتیں ہیں ہم غریبوں کے لئے بچپن، جوانی، بڑھاپا، سب ایک ہے۔ آنکھ کھولتے ہی ہم کام کرتے ہیں اور آنکھ بند کرنے تک کام ہی کرتے رہیں گے کمبخت نکمّا ہے معلوم ہے ماں گھر میں بخار میں پڑی پھنک رہی ہے جلدی سے کام ختم ہو جائے تو

جاکر اُس کی خبر لوں، یہ کہتی ہوئی وہ چلی گئی۔ اور میرے منہ سے نکلا اُف، سماج کا ظلم۔ کیا منّو بچّہ نہیں اس کو کھیلنے کا حق نہیں۔ اُس کی ضد کرنے کی عمر نہیں۔ زہرہ کی کے خلاف مزاج اگر کوئی بات ہو جائے تو گھنٹوں روتی اور پٹخنیاں کھاتی ہے۔ یہ غریب بچہ تھپڑ کھاکر بھی کام کرنے کیلئے مجبور ہے اُس کو اس کا احساس ہے تاکہ وہ غریب اور اچھوت بچّہ ہے۔ لیکن آزاد نہ منّو ہے نہ زہرہ ہی۔

ایک ذلت و فلاکت کے شکنجوں میں ہے، دوسری جاہ و تمکنت ثروت و حشمت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اسی طرح امیروں کی دنیا الگ ہے غریبوں کی الگ۔

سُکھ کسی کو بھی نہیں۔ دکھ ہی دکھ ہر جانب بکھرا پڑا ہے۔ کیا یہی آزادی ہے؟

نِگاہیں

تسنیم سلیم چھتاری

تسنیم سلیم

میری زندگی میں کوئی ایسا سنہرا ورق نہیں جو دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے اور میری داستانِ حیات صرف اتنی ہے کہ ۱۹۲۶ء میں نواب صاحب چھتاری کے یہاں ۱۰ جولائی کو نینی تال میں جنم لیا اور اُسی دن سے اجتناب بلا مقصد زندگی گزار رہی ہوں۔ ابا جان کو اپنے کام اور میرے پیاسے کہاں فرصت تھی جو پڑھائی پر نظر ڈالتے اور اماں جان کی باتوں پر کون توجہ دیتا تھا۔ وہ پھکنی اور دست پناہ کی تعریف کرتیں یا سوئی ڈورے کا قصیدہ کہتیں، ہم مستقل مزاجی سے سبق کے وقت افسانے پڑھتے اور املا کے وقت ڈرامے لکھتے رہتے۔ بڑے بھائی جان راحت سعید اس "نیک کام" میں بہت مدد کرتے تھے۔ بیچارے اپنے جیب خرچ سے ناول اور افسانے لا دیتے اور جو کچھ میں لکھتی اس پر تنقید بھی کرتے۔ تاہم مجھے اُن سے اس امر کا شکوہ ضرور ہے کہ خود تو شاعر اور افسانہ نگار، مقرر اور نثار سب کچھ بن گئے اور مجھ کمبخت کو ایسا بیچ میں لٹکایا کہ نہ تو گھرداری آتی ہے۔ نہ صحیح معنوں میں کچھ لکھ ہی سکتی ہوں۔ میں نے افسانے لکھنے شروع کیے تو مشکل سے میری عمر دس گیارہ سال کی تھی لیکن اُسوقت تک کوئی افسانہ مکمل نہ ہو سکا۔ ۱۹۴۱ء میں جب میری عمر ۱۵ سال تھی میرا پہلا افسانہ "جل پری" چھپا اس سے ہمت بڑھ گئی۔ اماں جان کو یہ غیر ضروری مشاغل اتنے عجیب لگتے تھے کہ اکتا کر میرے ماموں زاد بھائی سلیم سے میری شادی کر دی۔ نواب صاحب طالب نگر کے جو ماموں سے خسر بن گئے ہیں میرے ذوق کی ہمت افزائی کی اور میں نے اطمینان سے آپ کا اور اپنا وقت ضائع کرنے کیلئے باقاعدہ افسانہ نگاری شروع کر دی۔ مجھے ہمیشہ المیہ چیزوں سے دلچسپی رہی۔

اُف وہ نگاہیں ...... برمے کی طرح میرے دل، میرے جسم اور میری روح کو چھیدتی ہوئی پار نکل جاتی ہیں ..... میں بے حس و حرکت بیٹھا رہ جاتا ہوں، اور وہ دو آنسوؤں سے لبریز آنکھیں بڑے اطمینان سے مجھے سرتاپا چھلنی کر دیتی ہیں ......
ابھی بیٹھا ہوں ہنس رہا ہوں باتیں کر رہا ہوں اور بجلی کی طرح سے وہ منظر آنکھوں کے سامنے کوند گیا جس پر دو آنکھوں اور محض دو آنکھوں کا تسلط تھا ...... کچھ گھنٹے ایسے جیتے جی جہنم میں گزر جاتے ہیں کہ میں گردوپیش سے بے خبر ہو کر گر اُٹھتا ہوں ....
.... اور پھر رفتہ رفتہ حواس لوٹتے ہیں .... مگر کب تک! .... پھر وہی نگاہیں .....

.... چار دن تو بھی مشکل سے شرمائی ہوں گی پھر انھوں نے گھونگھٹ الٹ کر دیکھا تو گھر کا نقشہ ہی دگرگوں پایا. گھر میں لے دے کے ہم دو بھائی یا ہمارے بڈھے ماں باپ .... گاؤں کا رہنا جہاں نہ سینما اور نہ تھیٹر نہ سہیلیاں نہ کلب! بھابی کلکتے سے آئی تھیں اور ہم پسند اور شور و شغب کی عادی ...... اس ماحول نے ان کو حواس باختہ کر دیا ...... ہر چند کہ بھائی جان بہت سعادت مند قسم کے شوہر ثابت ہو رہے تھے مگر ان سے کہاں تک سر مغزی کرتیں ...... مجھ پر تو لگتا تو میں بہت جلد ہی میدان چھوڑ دیتا اور وہ فاتح ہونے کے باوجود کھسیانی ہنسی ہنستی رہ جاتیں ..... ایک دن انھوں نے بہت جل کر کہا۔

"فرید یہ کیا مصیبت ہے تم پڑھ لکھ کر بھی عورتوں سے زیادہ شرمیلے ہو۔ مذاق سے جھینپ جاتے ہو، باتوں سے بوکھلا جاتے ہو .... ذرا اچھ کہہ دیا تو منہ سرخ! بھئی ایمان سے مجھے تو اس طرح دقّی ہو جائے گی"

میں نے مظلومانہ انداز سے بھائی جان کی طرف دیکھا اور انھوں نے فوراً ہی اپنی شوخ وطرار بیوی کا ساتھ دیا "واقعی فرید تم تو انتہا کرتے ہو ...... بھئی تمھارا رشتہ تو بہت ہی دلچسپ قسم کا ہے ...... ایم۔ اے کر کے بھی بولنا نہ آیا ..... اب یہ ہم لوگوں کا مذاق اڑاتی ہیں تم جواب کیوں نہیں دیتے؟"

بھابی نے جلدی سے کہا "کہہ دو کہ ہم کو شرم آتی ہے"

اور میں واقعی شرما گیا "واہ رہنے دیجیے میں کیا لڑکی ہوں جو شرماؤں"

"مصیبت تو یہی ہے کہ آپ لڑکی نہ ہونے کے باوجود شرماتے ہیں!"

"آپ کا لحاظ کرتا ہوں" میں نے اپنی بات بنانی چاہی "کہیں واقعی بولنے

لگا تو..... بس بکھر رہ جائیے گا.......“

”منہ دیکھیتی!“ بھابی نے میرا فقرہ پورا کیا اور اس کے بعد ایک عادہ طنزیہ قہقہہ جو لگایا تو میرے رہے سہے ہوش بھی جاتے رہے

دو چار مہینے یہاں رہ کر وہ بہت ہی گھبرا گئیں اور میکے گئیں تو واپس آنے کا نام نہیں لیتی تھیں....... ادھر بھائی جان کی یہ حالت کہ دن کا چین اور رات کی نیند غائب۔ خطوط سے ہار کر تار دینے شروع کئے تو وہاں سے جواب آتا ہے کہ ”پہلے وعدہ لیجئے کہ وہ مجھ سے اچھی طرح بات چیت کیا کریں گے یا نہیں؟“

بھائی جان نے کہا ”یار خدا کے لئے تم خود لکھ دو کہ صاحب قسم کھاتا ہوں اب ایسی زبان چلاؤں گا جو آپ بھی عاجز ہو جائیں“

میں نے بہت موثر پیرائے میں وعدہ واثق کیا تو وہ تشریف لائیں اسٹیشن پر ہی انھوں نے ہنس کر مجھ پر حملہ کیا ”اے ماشا اللہ سے کیا نکھار آیا ہے۔ اب تو اور بھی جہاں سوز لگتے ہو....... کہیں شادی سے پہلے تمھیں دیکھا ہوتا تو.......“

دل میں لاکھوں جواب آئے۔ مگر ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ کہ بس جیسے سر پر جوتیاں پڑ چکی ہوں۔ دو چار دن بعد بھابی نے فرمایا ”اس دفعہ تو میں سوچ ہی تھی کہ اپنی چھوٹی سی بہن سیمیں کو گھر سے لے آؤں“ کہتے کہتے بھابی کو اپنی چھوٹی سی بہن سیمیں پر لاڈ آیا اور انھوں نے اس طرح سے منہ بنایا جیسے کوئی ننی سی بہن سیمیں سامنے ہی کھڑی ہے۔

بھائی جان نے کہا تو پھر آپ کیوں نہ ساتھ لے آئیں....... آپ کا دل بہلتا رہتا اور تنہائی کا احساس بھی جاتا رہتا۔“

میں بھی اسی کوشش میں تھا کہ کوئی سنجیدہ موضوع چھڑے تو ایک آدھ بات کہہ کر اپنے سر سے کم گوئی اور جھینپ کا الزام مٹاؤں۔" میں نے کہا۔" اچھا تھا بھابی اگر آپ اُن کو ساتھ لے آتیں ...... نہ صرف آپ کی طبیعت بہلتی بلکہ مجھے بھی ایک مشغلہ مل جاتا ..... مجھے بچے بہت پسند ہیں بس ہر وقت اُن کو کھلایا کرتا۔"

فقرہ ختم کرتے کرتے میں نے محسوس کیا کہ بھائی جان کی آنکھیں چمکنے لگیں اور بھابی جان کے چہرہ پر نور و نار کا طوفان اُمڈ پڑا انھوں نے تڑپ کر کہا "کیا کہا تم اُسے کھلایا کرو گے !"

"بھائی جان نے ہکلا کر فرمایا ..... تم جانتے بھی ہو وہ ... وہ"

بھابی نے فقرہ پورا کیا۔" وہ بی. اے کا امتحان دے رہی ہے اس سال"

میرا دم نکل گیا کس کمبخت کو معلوم تھا کہ .... بھابی نے میرا کندھا ہلا کر کہا۔" ہاں فرید تو پھر تم اُسے کھلایا کرو گے۔"

کچھ دیر کے لئے میرے حواس گم ہو گئے اور قہقہوں کی زد سے بچ کر بھاگا تو اپنے کمرے میں آکر دم لیا۔

یوں تو سیمیں کے نام سے بھابی نے مجھے بلا ناغہ چھیڑنا ہی شروع کر دیا تھا مگر میرا اُس دن خون خشک ہو گیا جب پتہ چلا کہ وہ چھوٹی سی بہن سیمیں بی۔ اے سے فارغ ہو کر بہن صاحبہ کے پاس تشریف لا رہی ہیں۔

ان دنوں بھائی جان کچھ نئی نئی باتیں سوچا کرتے تھے اور بھابی خود اپنے حال زار سے شرما رہی تھیں میرے پاس اس سلسلے میں کہنے کو بہت سی باتیں تھیں مگر ہمت نہ پڑتی۔ اس کے بعد پتہ ملا کہ سیمیں آ رہی ہیں تا کہ کچھ دن بعد اپنے بھانجے یا بھانجی اور

دفعتہ ماں بنجانے والی ہمشیرہ عزیزہ کی دیکھ بھال کر سکیں۔ یہ سوچ کر تھوڑا اطمینان ہوا کہ بھابی جان تو آرام فرمائیں گی اور وہ مصروف رہیں گی لہذا کسے فرصت ہوگی کہ میری جان کو آئے۔ پھر بھی بات اپنی جگہ پر خطرناک تھی۔

بھائی جان ان کو لینے کلکتہ چلے گئے، جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے میری ہول بڑھتی جاتی تھی کہ اگر وہ بھی بہن صاحبہ کی جواب ہوئیں تو اب وہ ہری مارپڑا کرے گی۔ یہاں تک کہ ایک شام وہ آ پہنچیں۔

بھابی کی اضطرابی کیفیت اس محبت و مسرت کی ضامن تھی جس کا تعلق بہن صاحبہ سے تھا اور میری حواس باختگی اس پریشانی اور وحشت کا مظہر تھی جو مجھے بیک وقت دو خسر یہ ترین خواتین کے درمیان گھر جانے سے محسوس ہونے والی تھی بہرحال ہم دونوں دھڑکتے دل سے برآمدے میں بیٹھے اسٹیشن سے واپس آنیوالی موٹر کا انتظار کر رہے تھے...... میں نے بھابی کی بہت خوشامد کر لی تھی کہ ان کے سامنے یہ نہ کہیں کہ میں نے ان کو کھلانے کا تذکرہ کیا تھا۔ مگر بھابی تو اور بھی نہ جانے کیا کیا سوچے بیٹھی تھیں اور بے چین ہو ہو کر گھڑی دیکھ رہی تھیں...... اس سے قبل کہ موٹر پوری طرح رکے بھابی صاحبہ کی بہن صاحبہ نے اس میں سے چھلانگ لگائی اور "آپا جان" کے گلے کا ہار بن گئیں میں ڈرتا ڈرتا دیکھ رہا تھا اور جب انھوں نے میری طرف دیکھا تو میں نے گھبرا کر سلام کر لیا مسکراہٹ کی ایک دوڑتی ہوئی لہر ان کے چہرے سے گذری اور انھوں نے اپنی آپا جان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"یہی ہیں وہ فرید...... جو تمھیں گود میں کھلانے کے بہت شائق تھے"

گویا کہ بھابی جان بذریعہ خط ہی ان کو مفصل حال لکھ چکی تھیں ....اور

میں اُس چور کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا جسے عین چوری کرتے وقت پکڑ لیا گیا ہو۔۔۔۔ ہاتھ پیروں میں ہلکا سا رعشہ محسوس ہو رہا تھا۔

"اچھا اچھا یہ۔۔۔۔۔۔ میں تو سمجھی تھی کہ یہ خود بھی بہت چھوٹے سے ہوں گے۔"

"کچھ بڑے بھی نہیں۔" بھابی نے کہا۔ "بہت سی باتیں بچوں جیسی ہیں۔ مثلاً یہ کہ لڑکیوں کے ساتھ کھیلنے کا شوق!"

"واقعی" انھوں نے گھور کر مجھے دیکھا۔

"ہاں تم دیکھ لینا اب تم کو کھلایا ہی کریں گے۔"

بس پھر آخر مرد تھا مجھے عورتوں سے ڈرنے میں عبرت آگئی اور میں نے زخمی سانپ کی طرح پلٹ کر کاٹا۔ "اور بھابی آپ تو میرے شوق کی تکمیل کا خاص خیال رکھتی ہیں نا۔۔۔۔ اسی لئے تو شاید یہ۔۔۔۔۔۔ ہمارا ہونے والا بھتیجا۔"

بھابی کے وہم میں بھی نہ تھا کہ میں اُن کی دکھتی ہوئی رگ چھیڑ دوں گا۔۔۔۔۔۔ وہ سچ مچ ساکت ہو گئیں اور سیمیں نے ہنس کر کہا۔ "آپا جان آپ نے بھی ناحق بدنام کیا تھا۔ اچھا خاصہ تو جواب دے لیتے ہیں۔"

بھی دن میں نادر یہ کہ سارے گھر میں گھومتا رہا کہ اگر ان دونوں بہنوں کو سرگوشی سے فرصت ہوئی اور میری طرف توجہ دی تو ہرگز بھی چپ نہ رہوں گا۔ واہ مذاق ہی بنا لیا ہے۔ یہ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ سیمیں خالص سیمیں ہی نہیں بلکہ سونے اور چاندی کا مرکب ہیں یہ حاضر جوابی و حاضر دماغی میں بہن سے چار قدم آگے ہیں صورت معصوم مگر سنجیدگی معدوم! ہر وقت ایک دھیمی سی مسکراہٹ ہونٹوں پہ مچلتی رہتی تھی اور تیز نگاہوں سے لمحوں میں ہر چیز کا جائزہ لے ڈالتیں۔

دو چار دن تو ذرا بے نیازی برتی اس کے بعد قطعاً بے تکلف ہو گئیں۔ جب جی چاہتا میرے کمرے کی خانہ تلاشی لی جاتی کبھی اسکو اس طرح الٹ پلٹ کر دیا جاتا کہ جوتے ہینگر پر ٹنگ جاتے اور کپڑے فرش پر بکھر جاتے۔ کبھی کچھ جی میں آتا ساری چیزیں سلیقے سے رکھ دی جاتیں۔ میں پہلے اُن کی شرارتوں سے ڈرتا تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ مانوس ہوتا گیا۔ انھوں نے میری خاموشی اور شرم کو توڑنے کے لئے اور بھی اچھی چال چلی جب کبھی تنہا بیٹھتیں تو بڑی بیباک بنکر کسی بات پر بحث لے بیٹھتیں۔ انکو پتہ چلا کہ مجھے غالب سے عشق ہے تو اُسکے اشعار کی بُرائی شروع کر دی اور میں مجبور ہو گیا کہ تعریف ثابت کروں۔ ایک دن مجھ سے پوچھا کہ زمانۂ حاضر کے اردو افسانہ نگاروں میں آپکو کون سب سے زیادہ پسند ہے۔ میں نے کہا "احمد ندیم قاسمی" وہ کہنے لگیں "واہ کتنے بے رنگ تو ہوتے ہیں اُن کے افسانے" اور میں نے اس جواب پر حیران ہو کر اُن کو احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کی رنگ ریز دکھائی شروع کی۔ اسی طرح لاکھوں مسئلے چھیڑ کر وہ مجھے اپنے ساتھ باتیں کرنے پر مجبور کر دیتیں۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ آگیا کہ جب میں اپنے دل کو اُن کے پاس بیٹھنے اُن سے باتیں کرنے اور اُن کو دیکھنے پر مجبور پانے لگا۔

بھابی جان فقرے کستیں کہ واقعی تم زبیمیں کے ساتھ ہر وقت کھیلتے ہو۔ اور بھائی جان علیحدہ ہم دونوں کو محبت سے باتیں کرتے ہوئے دیکھتے تو زیر لب مسکرا دیتے ..... سیمیں کی عادت تھی کہ تنہائی میں مجھ سے باتیں کرتیں تو بہت سنجیدہ ہو جاتیں اور مسکراہٹ کی اس لہر کے علاوہ جو اُن کے ہونٹوں سے وابستہ تھی کبھی ارادتاً نہ ہنستیں ہاں جب کبھی بھابی اور بھائی جان موجود ہوتے تو اُن کے انداز قابل دید ہو جاتے میری

ایک ایک بات کا مذاق بنجاتا ایک ایک فقرے پر قہقہے لگتے اور میں خوشی سے سب کچھ سنتا رہتا۔ میرا دل نہ چاہتا تھا کہ ان کی کسی بات کا بُرا مانوں یا ان سے کسی فقرے پر جھینپ جاؤں اور اُٹھ کر چل دوں بس یہی چاہتا تھا کہ وہ ہنس ہنس کر اور اپنی نگاہوں میں شوخی کی ساری چمک کو بروئے کار لا کر مجھ سے مخاطب رہیں اور میں یوں ہی چپ چاپ بیٹھا ان کی صورت دیکھا کروں۔

آخر وہ دلچسپ اور پرمسرت دن آ گیا جب بھائی جان پریشانی کے عالم میں ٹہل رہے تھے اور میں واقعہ کی نوعیت پر غور کر رہا تھا تو نوکر نے آ کر بتایا کہ ایک عدد بھتیجے تشریف لائے ہیں۔

مضطرب ہو کر میں پہلے سے مرتب کردہ پروگرام کے مطابق بندوق اٹھا کر بھاگا تاکہ دو چار ہوائی فیر کر کے اظہار مسرت کر سکوں اور دفعتہ زینے پر سیمیں سے ٹکر ہو گئی۔ اُنھوں نے ہانپتے ہوئے کہا "مبارک ہو" میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو وفور انبساط سے چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں قوس قزح کے سارے رنگ جھلک رہے تھے۔ کچھ دیر کے لیے میں نے اپنی منتظر اور منتشر آرزوؤں کو زبان دینے کے ارادہ سے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور وہ اسی طرح میرا چہرہ تکتی رہیں۔ کچھ ہمت بڑھی اور کچھ بیہوشی ..... میں نے اُن کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہا "سیمیں!" وہ چونک کر اس طرح پیچھے کو ہٹیں جیسے بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہو اور پھر مطعون نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

کچھ تو میں فطرتاً ہی بزدل ہوں اور یہ تو کھلی ہوئی شکست تھی شرمندہ اور پریشان ہو کر جو چلا تو مشکل سے دس بارہ سیڑھیاں طے کی ہوں گی کہ پیر پھسل گیا......

لمحوں میں گھر کے اندر یہ دوسرا ہنگامہ برپا ہوا۔ میں ٹھیک سے بیٹھ گئی۔ امّوں میں آ کر اُٹھا اور وہ چیخ چیخ کر گھر کو اکٹھا کر رہی تھیں۔ اول تو میں نے ان کو بتانا چاہا کہ خطرناک بات نہیں میرے ہوش بجا ہیں لیکن جب ان خاتون کو جنھیں میں نے غیر ارادی طور پر سجدہ کر لیا تھا بالکل ہی حواس باختہ پایا تو چپ ہو رہا کہ اُنھوں نے مجھے ڈرا دیا تھا اب خود ڈرنے دو۔

بیچارے بھائی جان جو نئے نئے باپ بنے تھے اور دل ہی دل میں پھولے نہ سمارہے تھے اس شور و غوغا کو سنکر لپکے ہوئے آئے..... میرے سر سے خون نکل رہا تھا اور بازو کی ہڈی پر ذرا زوردار قسم کی چوٹ لگ گئی تھی۔ اُنھوں نے فوراً اُٹھایا اور سب سے قریب بیگم کا کمرہ تھا لہٰذا وہیں اور اُنہی کے بستر پر جا لٹایا..... اگر ہر قدم لڑکھڑا کر ہی پڑے تو خوش قسمتی ہے ورنہ مجھ کو یہ فخر کہاں حاصل ہوتا..... میں نے شدت درد کے باوجود بھی اُن کو ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر نہ جانے وہ کہاں غائب تھیں۔ دیر بعد جب کہیں مرہم پٹی ہو چکی تو میں نے کونے میں ایک سہما ہوا زرد چہرہ دیکھا اور بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کچھ اس لئے کہ ان کو دیکھ کر میرا آدھا درد مٹ گیا اور کچھ اس لئے کہ میں اُن کی پریشانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اُنھوں نے جھینپی ہوئی مسکراہٹ سے میرا ساتھ دیا اور قریب آ کر آہستہ سے میرا ماتھا چھوا......... میں نے آنکھیں بند کر کے مسرت کا سانس لیا اور آنکھیں کھولیں تو وہ واپس جا چکی تھیں۔

میری یہ چیخ بہر صورت انتہائی بے موقع تھی مگر خود میرے حق میں ایک نعمت ثابت ہوئی بھابی تو اپنے بستر پر ساکت و جامد ہیں اور اماں جان نوزائیدہ

پڑنے کی آتو بھگت میں گرفتار! بھابی جان نے رات بھر میری پٹی سے لگ کر بیٹھنے کا اعلان کیا اور بھابی نے دن بھر خبر گیری کرنے کیلئے ستیّں کو میرے پاس بھیجا۔ ان کو دہشت تھی کہ گاؤں کا ماحول اور نسائی ذہنیت کہیں بچے کو منحوس قرار نہ دے کہ پیدا ہوتے ہی غریب چچا عروج سے نزول کی طرف مائل ہو گئے لہٰذا ستیّں کو ہدایت دی گئی کہ وہ پورا پورا خیال رکھیں۔ رات کو بھابی جان پلنگ کے پاس کرسی بچھائے بیٹھے رہے اور میں درد سے کراہتا رہا۔ صبح ہوتے ہوتے مجھ کو تکلیف کی شدت سے بخار ہو گیا اور جب وہ کمرے میں آئیں تو درحقیقت مجھے انتہائی تکلیف ہو رہی تھی۔۔

انھوں نے قریب آ کر کہا "فرید" میں نے نیم باز نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تو محسوس کیا کہ انتہائی اُداس اور پریشان ہیں پوچھنے لگیں "کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

میں نے کہا "سر کے درد سے دم نکل رہا ہے"

وہ سرہانے بیٹھ گئیں اور آہستہ آہستہ میرا سر دبانا شروع کیا۔ مجھے عجیب سے احساسات سے واسطہ پڑا۔ نہیں کہہ سکتا کہ میں اوپر کی طرف اُٹھ رہا تھا یا نیچے کی طرف دھنستا جا رہا تھا۔ بہرحال کچھ ایسا سکون ملا جو میں رات بھر مضطرب رہنے کے بعد صبح سویرے بے خبر ہو کر سو گیا۔ دس پندرہ دن تک میری طبیعت خراب رہی کاش یہ جاگتے میں دیکھا ہوا خواب دراز طویل ہوتا مجھے دق ہو جاتی اور رنجھ رنجھ کر اسی بستر پر دم توڑ دیتا..... کاش.......!

یہ چند روز میں نے مشیت پر حکمرانی کرکے گذار لے آخر کار شکست ہو گئی۔ میں بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا یا دوسرے الفاظ میں وہ تخت چھوڑ دیا جس پر بیٹھ کر میں نے دنیا کی ہر شے پر حکومت کی تھی اور ساتھ ہی میرا سب کچھ مجھ سے چھن گیا۔

یہ سب مجھے میں نے مکر و فریب کی دنیا سے بہت دور گذارے جہاں صرف ایک بے فکر دل اور دو پُرنم آنکھوں کا راج تھا۔

اس مختصر عرصہ میں سیکڑوں دفعہ اُن کی آتشیں سانسوں نے میرے رخساروں میں بجلیاں بھر دیں، ہزاروں مرتبہ ان کے بکھرے ہوئے بال میرے ہوش و حواس کی دنیا پر چھا گئے، لاکھوں مرتبہ میں نے اُن کی پھسلتی ہوئی باہوں کو چھوا اور کروڑوں مرتبہ ان شفاف جھیلوں میں اپنی آنکھیں جما کر اپنے سارے دکھ دھوئے جو اکثر میری تکلیف سے متاثر ہو کر اُمڈ پڑتی تھیں۔

جب بخار اُتر گیا، زخم مندمل ہونا شروع ہوئے تو اُنھوں نے مجھ سے دور ہٹنا شروع کیا، میری طرف سے توجہ ہٹنے لگی ...... یہ دکھ اپنی جگہ پر سب سے بڑا تھا مگر کون دیکھتا، کسے پتہ چلتا، مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی جو اُن سے کہوں کہ دیکھیں اب میں بہت آگے بڑھ چکا ہوں، خدارا مجھے راستہ میں تنہا چھوڑ کر نہ لوٹو۔

ایک دن میں نے کہا "سنیں! دیکھئے آپ نے عرصے سے میرے کمرہ کی خبر نہیں لی سب گندہ پڑا ہے۔"

اُنھوں نے جواب دیا "کچھ میں نے ذمہ تو نہیں لیا۔ آپ خود صاف کیجیے۔"

"میرا تو خیال تھا کہ آپ نے ذمہ لے لیا ہے........"

"جی ہاں اسی لئے آپ کاہل ہو گئے ...... معاف کیجئے صاحب، کل کو آپ کہدیں کہ میری کوئی چیز غائب ہو گئی۔"

میں نے ہمت کر کے جواب دیا "یہ تو آپ کو پہلے سے سوچنا چاہئے تھا کہ آخر اتنے دن آپ نے ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کیا ہے میں اب بھی کہہ سکتا ہوں کہ میری کوئی چیز غائب ہو گئی"

انھوں نے سنجیدگی سے میری طرف دیکھا اور الفاظ پر زور دیکر کہا "میں آپکو یقین دلادوں گی کہ آپکو غلط فہمی ہوئی ہے میں چور نہیں اور نہ مجھے کسی کی چیز وغیرہ چرانے کا شوق ہے۔"

انھیں سنجیدہ اور ایک حد تک برہم پاکر میں نے عرض تمنا کو پھر کسی وقت کے لئے اٹھا رکھا..... مجھے اس کا تو مکمل یقین تھا کہ سیمیں تغافل برتیں یا اظہار بے اعتنائی کریں مجھ کو ٹھکرا نہیں سکتیں۔

میں ہی ان کے نزدیک نہیں گیا بلکہ وہ بھی مجھ سے قریب آچکی ہیں اس لئے میرے دل کو اطمینان تھا اور میں اس موقع کا منتظر تھا جب میرے الفاظ حلق ہی میں اٹک اٹک کر نہ رہ جائیں اور ان کے ماتھے پر شکن نہ پڑے تو میں ان سے بہت دنوں کی سوچی ہوئی باتیں کہہ ڈالوں۔

پھر ایک دن یوں ہی میں باہر سے گھوم کر لوٹا تو میں نے انھیں اپنے کمرہ میں بکھری ہوئی چیزوں کو بازتیب رکھتے ہوئے پایا۔ میں دروازے ہی میں رک کر کھڑا ہو گیا انھوں نے آہٹ پاکر نظر اٹھائی تو مجھے دیکھ کر مسکرا دیں۔

میں نے کہا "خدا کا شکر ہے آپ کو اس تباہ حال کی فکر تو ہوئی"

جواب دینے کی بجائے وہ میز پر بیٹھ گئیں اور دوپٹہ کو سلیقے سے شانوں کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا "میں نے سنا نہیں کیا کہہ رہے تھے آپ۔"

"میں کہہ رہا تھا آپ نے توجہ دی ہے تو خدارا اب بے فکری نہ برتئے گا۔ ورنہ اور بھی حالت زار ہو جائے گی۔"

کہنے لگیں "یہ تو میں جانتی تھی کہ بس ایک دفعہ آپ کا کام کر دیا تو آپ پڑ ری

بلا میرے سر ڈال دیں گے .... نہیں ہیں وعدہ نہیں کرتی اب تو سب ٹھکانے سے لگائے دیتی ہوں پھر آپ جانیں اور آپ کا کام!"

میں نے کہا "میں تو کبھی بھی کوئی واسطہ رکھنا نہیں چاہتا"

"ہنس کر جواب ملا "آپ نے مجھ کو نوکر مقرر کیا ہے؟"

"توبہ کیجئے۔ نوکر نہیں .... اپنا کام کرنا نوکری نہیں سمجھا جاتا"

"اپنا کام ہو تبھی نا؟ سوال تو آپ کے کمرے کا ہے"

"آپ اس سے غیریت کیوں روا رکھتی ہیں؟"

"آپ کی چیز جو ہوئی"

"اسے اپنا لینا تو بھی ممکن ہے"

انھوں نے چونک کر میری طرف دیکھا اور میں نے لحموں میں بہت سے رنگ ان کے گلابی چہرے پر سے گزرتے دیکھے ..... انھوں نے مینز پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا اور بھنچے ہوئے لہجے میں کہا "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی"

"میں آپ کو زندگی بھر کے لیے اپنا ساتھی بنانا چاہتا ہوں" یہ کہتے کہتے میں نے محسوس کیا کہ میں ان کی بات کا جواب نہیں دے رہا بلکہ زندگی بھر کے امتحان کا سب سے اہم سوال ہے اور جواب پر میری حیات کا مدار!

وہ کھڑی ہو گئیں اور کچھ ہکلاتے لہجے میں کہا "آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شادی نا؟"

"ہاں یہی"

"فرہاد صاحب ...... خدا کے لئے ایسی بات تو سوچئے گا بھی نہیں" یہ کہہ کر

انھوں نے جانے کا ارادہ کیا اور میں نے لپک کر راستہ روکا۔

"کیوں ..... آخر اس میں کیا حرج ہے؟"

"یہ نہیں ہو سکتا" انھوں نے اٹل فیصلے کے طور پر کہا۔

"کیوں ..... میرے گھر والوں کا تو سوال ہی نہیں، رہے آپ کے گھر والے تو اُن کے متعلق بھی مجھے یقین ہے کہ ......"

"میرے گھر والوں کو چھوڑیئے وہ منظور کریں تب بھی ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"پھر کیا وجہ ہے کیا آپ منع کر دیجئے گا۔" مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے بجائے سیمیں سے سوال کرنے کے اپنے منکر نکیر سے پوچھا ہے کہ بتاؤ میرے اعمال کیا ہیں خدا نے میرے لیۓ جنت کو تجویز کیا ہے یا دوزخ کو؟"

"منع" سیمیں نے طنزیہ طور پر ہنستے ہوئے کہا "معاف کیجیے گا فرمایۂ صاحب میرے ماں باپ کی ناک زیادہ نہیں جو مجھے کٹوانے کی فکر پڑے گی"

"پھر کیا کیجیے گا؟" میں نے سمجھا کہ وہ مجھے چھیڑ رہی ہیں اور بس!

"کرنے میں کونسی دقت پیش آتی ہے ...... یہ ...... یہ ....." انھوں نے اپنی اُنگلی کے گرد ہیرے کی انگوٹھی کو گھمایا۔

"کیا مطلب!؟" حالانکہ اُن کا اشارہ صاف تھا۔

"مطلب یہ کہ ہیرا ہے نا؟ آپ جانتے ہیں کہ اسے کھا کر بڑے اطمینان کی نیند سویا جا سکتا ہے ...... زہر ہوتا ہے یہ۔"

"تو آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ خودکشی ......"

"کہنا تو نہیں چاہتی تھی مگر آپ نے کہنے پر مجبور کر دیا۔"

"سیمیں تم مجھ سے نفرت کرتی ہو؟"

"مجھے دنیا کی کسی شے سے بھی نفرت کرنے کا حق نہیں۔"

"تو پھر.........؟"

"پھر یہ کہ میں اپنے دل کو مجبور نہیں کر سکتی۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔"

"فیصلہ........"

"جی ہاں فیصلہ....... اگر اپنے منتخب کردہ انسان کے علاوہ مجھے کسی ایک کے ساتھ بھی شادی کی حماقت کرنی پڑی تو اس سے قبل ہی میں اپنے فیصلے پر عمل پیرا ہو جاؤں گی....... جو میری موت ہو گا۔"

"تو آپ منتخب کر چکی ہیں" میں نے اپنے کو گرتے ہوئے محسوس کر کے کرسی کا سہارا لیا۔

انھوں نے مطمئن انداز سے کہا "ہاں فرہاد، جہاں تک میں سمجھتی ہوں میرے والدین کو میرے انتخاب پر مسرت ہو گی..... مگر کوئی اور قدم اسطرف اٹھا تو مجبوری..."

میں نے صرف ان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ منترحم انداز سے میرے قریب آئیں۔

"میری بات کا برا نہ مانیئے گا۔ میں نے یہی بہتر سمجھا کہ آپ سے صاف صاف کہدوں.... مجھے اس کا یقین ہے کہ اگر آپ کو میری زندگی عزیز ہے تو آپ میری بات کا ضرور خیال رکھیں گے۔"

میں نے اپنی پسپا طاقتوں کو جمع کر کے کہا "میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں" اور اس کے بعد وہ سر جھکائے ہوئے چلی گئیں۔ میں اس خود ساختہ جہنم میں جھلستا رہ گیا۔

...... کئی دن ایسے گزرے جب مجھے ایک درد، ایک ٹیس، اور ایک جلن کے سوا دنیا کی کسی چیز کا ہوش نہ تھا...... اُنھوں نے کئی مرتبہ مجھ سے کچھ کہنا بھی چاہا شاید وہ سمجھتی تھیں کہ اب بھی میری تسکین کا کوئی ذریعہ باقی رہ گیا ہے مگر مجھ میں اتنی سکت نہ تھی کہ اُن کی بات سننا تو درکنار اُن کے سامنے کھڑا بھی رہ سکوں۔

ایک شام جب میں کچھ دیر باغ میں گھومنے کے بعد اپنے کمرہ کی طرف لوٹ رہا تھا تو میں نے اُن کو کھڑکی کے سامنے کھڑے دیکھا۔ اُنھوں نے مجھے اشارے سے بلایا...... میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کیا کچھ اور رہ گیا ہے جو وہ مجھ سے کہنا چاہتی ہیں..... میں کھڑکی کے سامنے نیچے آکر رک گیا۔

اُنھوں نے کہا "دیکھیے ہزار! ابا جان آرہے ہیں..... جانتے ہیں کیوں؟ مجھے اور آپا جان کو لے جانے کیلئے۔"

میں نے ان کی طرف دیکھا منہ سے کچھ نہ کہا...... کچھ کہہ ہی نہ سکا۔

انھوں نے پھر کہا "میں جاتے جاتے یہ چاہتی ہوں کہ اگر آپ کے دل میں میری طرف سے کوئی غلط فہمی ہو تو وہ دور ہو جائے۔"

"غلط فہمی تو آپ نے دور کر دی....... اب تو میرے سامنے حقیقت ہے خواہ وہ تلخ ہی کیوں نہ ہو۔"

وہ کہنے لگیں "آپ اس کا ذمہ دار مجھے تو نہیں سمجھتے؟"

"اتنا ضرور ہے کہ آپ نے مجھے دھوکے میں رکھا۔"

"دھوکہ!؟" انھوں نے چونک کر کہا "میں نے آپکو دھوکے میں رکھا؟"

"ہاں سیمیں....... آپ نے میری بیماری کے دوران میں جو سلوک کیا تھا

اُس نے مجھے غلط راہ پر لگا دیا...... میں پہلے بھی لڑکھڑاتا تھا مگر اس طرح نہ گرتا جیسے اب......"

"آپ اسے دھوکا سمجھتے ہیں...... وہ تو انسانی فرض تھا......"

"یہ انسانی فرض تھا...... آپ نے میرے درد پر آنسو بہائے۔ آپ نے سارا سارا دن میرے پاس بیٹھ کر گذارا۔ آپ میرا سر دباتی تھیں۔ آپ میری دوا اور غذا کا خیال رکھتی تھیں...... جانتی ہیں آپ اُس نے مجھے کیا کچھ سمجھا دیا......"

"آپ کو غلط سمجھایا گیا...... اول تو وہ میری انسانیت تھی دوسرے آپا جان کی خواہش۔"

میں نے کہا "تو چھوڑیئے اس ذکر کو اتنا ہی پردہ پڑا رہتا تو اچھا تھا۔ میں سمجھتا کہ شاید آپ کو میری ذات سے ذرا سا بھی تعلق ہو" اور کہتے کہتے رو کنے کے باوجود میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کھڑکی سے اُٹھ کر میرے پاس آگئیں فرید، آپ تو انتہا کرتے ہیں۔ یہ کیا کہ رونا شروع کر دیا...... تو یہ تو بے مرد کہیں رویا کرتے ہوں گے۔"

میں نے کہا "آپ چڑ کے کیوں لگاتی ہیں جو ہوا اچھا ہوا۔ میں آپ سے وعدہ تو کر چکا ہوں مطمئن رہیئے"

"کیسا وعدہ؟"

"یہی کہ مجھے اپنے دل سے آپ کی جان زیادہ عزیز ہے۔ میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرونگا جو آپ کو خودکشی پہ مجبور کر دے۔"

"خودکشی" انھوں نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا "میرا خیال غلط تھا میں

جانتی ہوں کہ خودکشی نہ کر سکوں گی"

"تو پھر ......"

"پھر کچھ نہیں ......"

"افسوس کیجئے گا ! ؟"

"ہاں اس پہ کس کا اختیار ہے ...... مگر میرے افسوس کی پروا کون کرے گا ......"

"کوئی بھی نہیں !"

"وہ جس کے افسوس کی آپ کو خود پروا نہ ہو سکی"

"یہ بھی آپ کی غلط فہمی ہے"

"جانے دیجئے ان باتوں کو ...... خدا کرے آپ خوش رہیں اور کامیاب زندگی بسر کریں" میں نے صدق دل سے کہا۔

"کاش ایسا ہی ہو ...... قریب میں چلی بھی جاؤں تو مجھے اپنی دعاؤں میں شامل رکھیے گا۔"

اُن کے چہرہ پہ ہنسی کی موجیں بکھر گئیں اور جسے چھپانے کی کوشش میں وہ کچھ اور کہے بغیر وہاں سے چلی گئیں ..... میں کھڑا سوچتا رہا کہ وہ اظہار ہمدردی کر رہی تھیں یا کچھ اور سنانا مقصود تھا۔

بھائی جان کے والد آ گئے۔ وہ مجھ سے دیر تک پوچھتے رہے کہ تمہارے خیال میں تمہیں کی تعلیم وغیرہ کیسی ہوئی ہے میں تعریف کرتا رہا ..... حالانکہ ان کا تذکرہ میرے لئے ایسا تھا جیسے کوئی رہ رہ کر ڈنک لگاتا ہو۔

جب وہ جانے لگیں تو میں کچھ دیر قبل ہی بھابی جان کو خدا حافظ کہہ کر
اپنے کمرہ میں جا لیٹا۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ خوشی سے کھڑے ہو کر ان کو رخصت کر سکوں
اگر کسی کے سامنے ذرا سی بھی بے حواسی کا اظہار کر بیٹھا تو کیا ہوگا۔

کچھ دیر بعد میں نے دروازے پہ ان کی آواز سنی "ارے یہ کیا سو رہے
ہیں ...... جیسے خبر نہیں کہ لوگ جا رہے ہیں"

"میں جانتا ہوں" اور میں پلنگ سے اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"تو پھر یہ رخصت کرنے کا نیا ڈھنگ نکالا"

"نیمی! آپ جانتی ہیں کہ میرا دل بہت کمزور ہے ..... میں نہیں چاہتا
کہ کوئی بھی میری حالت کو دیکھ سکے یا نہ ابھی سمجھ سکے ...... اور کیا یہ بھی بتانے
کی ضرورت ہے کہ میں اسے ہنس کر نہ سہہ سکوں گا"

انھوں نے اطمینان سے میرے برابر بیٹھتے ہوئے کہا "خیر مجھ سے تو بات کیجیے"

میں نے کہا "کاش مجھے آپ سے کچھ کہنے کا حق ہوتا ..... ہاں اتنا پوچھنا
چاہتا ہوں کہ پھر کبھی یہاں آیئے گا؟"

"ہاں کیوں نہیں ضرور"

"کب؟"

"آپ کی شادی پہ ......" بہت ہنس کر کہا۔

"تو اس کا مطلب یہ کہ آپ کبھی نہ آئیے گا"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں شادی ہی نہ کروں گا ...... مجھے حق نہیں کہ میں کسی کی

زندگی تباہ کروں۔"

"ارے یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"کیا آپ کو اس کا احساس نہیں کہ میں نے جس لڑکی سے شادی کی اُس کی زندگی بھی میرے ساتھ عذاب ہو جائے گی۔ کیا میں اس سے محبت کر سکوں گا۔ کیا میں اُسے خوش رکھ سکوں گا؟"

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہیں۔ پھر کہا "آپ سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں؟"

"خدا کی قسم میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ کبھی شادی نہ کرونگا۔"

وہ مضطرب ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگیں۔ "ایسا نہ کہئے اللہ کے واسطے۔"

"کیوں؟"

"بڑی حماقت ہو جائے گی۔"

"حماقت کیا ہو گی۔"

"میری بدنامی ہو گی اور کیا۔"

"میرے حال کی خبر ہی کس کو ہے جو آپ کی بدنامی ہو۔"

"نہیں صاحب آپ کیا جانیں..... سب یہی کہیں گے کہ...... اس کے علاوہ مجھے زندگی بھر ایک چبھن رہے گی۔"

"کیا اس کی چبھن کہ میری تباہی مکمل کیوں نہ ہو سکی؟"

"نہیں نہیں۔ آپ تو سمجھتے نہیں ہیں...... بھئی سچ بتائیے کیا واقعی...... توبہ توبہ کہیں ایسا نہ کر بیٹھیے گا۔"

"آپ کہہ رہی ہیں؟"

"محض کہہ نہیں رہی بلکہ آپ کو مجبور کر رہی ہوں۔"

"یہ حکم ہے؟"

"ہاں حکم۔ التجا جو بھی سمجھیے .... بہر حال آپکو میری قسم ......" "اچھا"

"اچھا"

"کیا؟"

"یہی کہ میں شادی کرونگا خواہ وہ بربادی ہی کیوں نہ ثابت ہو۔"

میرے جواب سے مطمئن ہو کر وہ مسکرائیں "تو اب چلتی ہوں ... وقت ہو گیا ہے" میں نے بے اختیار ہو کر کہا "رہیں!" اور نہ جانے مجھے لمحوں میں کیا ہو گیا انھوں نے میرے شانہ پر ہاتھ رکھ دیا "فرید آپ اتنے پریشان کیوں ہوتے ہیں ..... میں نے وعدہ تو کیا ہے آپ کی شادی پر آنے کا ..... اور ہاں سنیے ...... وہ تو میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ خودکشی کی بات محض یونہی تھی اور میں .... پھر آخر آپ ..... اچھا خدا حافظ ......"

وہ چلی گئیں اور میں اپنی تباہی کا ماتم کرنے کو رہ گیا۔

بھابی دو ماہ بعد لوٹ آئیں۔ یہ عرصہ میں نے اپنی ویران حالی پر دن رات آنسو بہا کر گذارا تھا۔ بھابی نے پہلی ہی نظر میں تغیر کو محسوس کیا! فرید! تم تو بہت دبلے نظر آ رہے ہو کیا قصہ ہے؟

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ بس یوں ہی بلا وجہ ......"

وہ مسکرانے لگیں .... دوسرے دن بھائی جان نے کہا "بھئی فرید! میں تم سے کچھ تمھاری شادی کے معاملے میں کہنا چاہتا ہوں۔"

میں جانتا تھا کہ ایک دن یہ بات ضرور چھڑے گی ۔" فرمایئے"

"ابا جان اور اماں جان کی خواہش ہے .... اور میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیئے ۔"

"ضرور .... مگر کس سے ؟"

اوّل تو دو رشتے ایسے ہیں جہاں سے نفی کا جواب نہیں آسکتا۔ مگر خیر ایک کو چھوڑو دوسرا ابھی رہنے دو .... ساتھ ہی بھائی جان نے مسکرا کر معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا میرے دل پہ چوٹ سی پڑی مگر میں نے سنبھل کر کہا۔"

پہلا کون سا رشتہ ہے ؟"

"خالہ جان کی لڑکی کا ۔"

"کیا" بھائی جان نے چونک کر پوچھا۔

"یہی خالہ جان کی لڑکی کا رشتہ ۔"

"ٹھیک ہے ۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا مطلب یعنی تم بجائے ستیں کے .... !؟"

"ہاں میں بجائے ستیں کے اس رشتہ کو زیادہ مناسب سمجھتا ہوں ۔"

"مذاق تو نہیں کرتے" بھائی جان کا حیرت سے منہ کھلا رہ گیا

"جی نہیں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں ۔"

"تعجب ہے ......" وہ اٹھ کر ٹہلنے لگے: "میں تو سمجھا تھا کہ ...."

میں خاموش رہا

"تو تم خالہ جان کی لڑکی سے شادی کرنے کو تیار ہو ؟"

"قطعی"

"مگر فریدہ بیگم سے اس کا کیا مقابلہ۔ تم جانتے ہو کہ وہ تعلیم یافتہ بھی نہیں۔ اور سنا ہے کہ شکلاً بھی ......"

"مگر میں اسے پسند کرتا ہوں"۔

"خوب ...... حالانکہ تم نے اس کو دیکھا تک نہیں"

"جی نہیں میں نے اسکو دیکھا ہے جن دنوں میرا امتحان ہو رہا تھا ان دنوں خالہ جان بھی علیگڈھ آئی ہوئی تھیں اور میں نے ......" میں جھوٹ بول گیا۔

"تو یوں کہو" بھائی جان نے بہت افسردگی سے کہا۔ "مجھ کو اس کی خبر ہی نہ تھی ...... خیر ...... مگر میرے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ تم ...."

میں نے کہا۔ "یقیناً آپ کا یہ خیال نہ ہو گا میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی اس کے ساتھ اچھی گذرے گی"۔

"تمھاری مرضی ...... کیا تم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے"؟

"جی ہاں بہت اچھی طرح"

"تو میں ابا جان سے کہہ دوں کہ وہ خالہ جان کو لکھ کر معاملہ طے کرلیں"۔

"ضرور کہہ دیجئے"

"بھائی جان سمجھتے تھے کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے اور یہ سچ بھی تھا میرا دماغ، میرے ہوش وحواس سب خاک میں مل چکے تھے۔

مجھے جلد ہی پتہ چل گیا کہ رشتہ منظور ہو گیا اور ایک مہینہ بعد میری شادی ہو جائیگی۔ بھائی جان بہت افسردہ تھے اور بھابی نے تو ایک حد تک مجھ سے بات

کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ مگر میں کسے بتاتا کہ میں نے اُن سے وعدہ کیا ہے اور میں اسے زندگی کے آخری لمحہ تک نبھانا چاہتا ہوں۔ مجھے اُن کی محبت کو تباہ کرنیکا حق نہیں ہے۔

شادی میں بہت تھوڑے دن رہ گئے تھے اور ہر لمحہ جس طرح بجلی کی سُرعت سے گذرتا تھا اُسی طرح بجلی بنکر میرے نشیمن کا ایک ایک تنکا جلا کے راکھ کر جاتا تھا۔

ایکدن بھائی جان اور بھابی برآمدے میں بیٹھے تھے میں بھی آکے کھڑا ہو گیا بھائی جان نے مجھ سے کہا" فرید کمرہ میں آج کا اخبار پڑا ہوگا ذرا اُٹھا لانا۔"

میں اخبار لینے کے لئے کمرہ میں گیا تو میز پر بھابی کے نام کا ایک کھلا ہوا لفافہ دیکھا جس کے کونے پر "سیمیں" لکھا ہوا تھا۔ کسی بے اختیار جذبے کی تکمیل کے لیے میں نے لفافہ اُٹھا کر جیب میں ڈال لیا اور اخبار بھائی جان کو دیکر اپنے کمرے میں چلا آیا کانپتے ہاتھوں سے خط نکالا اور پڑھنے لگا ...... بس یہی دل چاہتا تھا کہ اُس کی تحریر دیکھ لوں۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد لکھا تھا:۔

" آپ یہ کیوں چاہتی ہیں کہ میں شادی میں شرکت نہ کروں۔ مجھے تو اسکی کوئی وجہ نہیں نظر آتی..... غالباً آپکی نگاہ میں وہی چھوٹی سی "سیمیں" ہے جو کبھی ہاتھ سے کھلونا چھن جانے پر بھی رو رو کر جان کا خون کر دیا کرتی تھی۔ نہیں آپا جان! اب تو میں بہت سمجھدار ہوں۔ بہت بڑی ہوں..... اب میں کسی بات پر نہیں روتی...... لہذا مجھے تقریب میں ضرور شرکت کرنی چاہیئے میں نے طے کر لیا ہے کہ میں ابا جان کے ساتھ پہنچونگی آپ مجھے نہ روکئے ..... اگر آپکا خیال صحیح بھی ہے تو اسمیں حیرت کیسی۔ دل پر جبر نہیں کیا جاتا..... میں آپکو اس کا بھی یقین دلا دوں کہ مجھ سے کبھی کچھ نہیں کہا گیا کبھی دھوکے کا تصور بھی نہیں ہوا ..... یہ بات تو مجھ تک محدود تھی اور میں آپکو بتا رہی ہی۔ کاش میں نے آپ سے

بھی نہ کہا ہوتا..... آپ بیکار غم کرتی ہیں. ایسا تو اکثر ہوا کرتا ہے ..... بہت ہنسنا بھی اچھا نہیں اور کبھی کبھی آنسو بھی تو آنکھوں کے لیے مفید ہوتے ہیں..... ہاں تو آپکو میری قسم جو ذرا بھی افسوس کریں..... میری فکر نہ کیجئے میں بہت بے حیا ہوں. مجھے کچھ نہیں ہوگا۔

خط ختم کر کے میں دیر تک سوچتا رہا کہ انھوں نے کیا اور کس کے متعلق لکھا ہے۔ پہلے فقرے سے تو میں بہت کچھ سمجھ چکا تھا کہ بھابی نے انکو آنے سے روکا ہے اور وہ آنا چاہتی ہیں اسلئے کہ وہ بڑی ہو گئی ہیں اور انکو تقاریب میں شرکت کرنی چاہیئے. مگر پھر اور مبہم باتوں سے کیا مراد ہے..... ایک دفعہ خیال آیا کہ باقی باتیں بھی تو اسی سلسلہ کی کڑی نہیں ہیں؟ ... مگر نہیں ... پاگل ... کہیں ایسا تو نہیں کہ انکی محبت کو بھی ناکامی سے واسطہ پڑ گیا ہو..... اے کاش .... نہیں نہیں. خدا نہ کرے. میں اتنا خود غرض نہیں اور پھر اس سے میری غرض بھی کیا پوری ہو گی۔

شادی سے ایک دن پہلے وہ اپنے والد کے ساتھ آگئیں مجھے پتہ چل گیا اور میں عمداً اپنے کمرہ سے باہر نہ نکلا۔ باہر چونکہ کثرت سے مہمان تھے اسلئے جانتا تھا کہ وہ میرے کمرہ میں نہ آسکے گی سامنے جانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر کیسی شدید تکلیف تھی الاماں! دل بیٹھا جا رہا تھا اور ہاتھ پیر سرد..... کاش وہ مجھے کفن پہنانے سے پہلے اصرار کے ساتھ نہ آئی ہوتیں. کاش انھیں میری حالت کا احساس ہوتا۔

جس دن شادی تھی اس دن کچھ رسومات کے سلسلہ میں مجھے زنانے میں بلایا گیا. ..... میری عجیب کیفیت تھی پیر ڈگمگا رہے تھے اور سانس گھٹا جا رہا تھا..... خدایا اگر اس وقت میں نے انکی طرف دیکھا تو کیا میں دل پر ضبط کر سکونگا؟ پتہ نہیں کیا کیا رسومات ادا ہوتی رہیں اور کون کون کیا کیا کہتا رہا. میں سر جھکائے نیم بیہوشی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتہً بھابی کی آواز سے چونکا وہ کہہ رہی تھیں "ارے ارے سیمی یہ کیا ہوا تجھے، تیری طبیعت تو ٹھیک ہے!؟"

میں نے مجبور ہو کر نگاہ اُٹھائی تو دیکھا کہ بالکل میرے قریب ہی وہ بھابی کا سہارا لیے کھڑی تھیں۔ اُنھوں نے بھابی کے کندھوں پر سر رکھا ہوا تھا میں ان کا چہرہ تو نہ دیکھ سکا، مگر ان کے زرکار کپڑوں کی خیرہ کن چمک سے آنکھیں ٹکرائیں اور میں نے اُن کی آواز سُنی۔

"کچھ نہیں آپا جان بس ذرا چکر آگیا ہے .... میں نے ہنسی ہنسی میں بہت سے پان کھا لیے اور کہیں بھولے سے تمباکو ...."

دل میں ایسا شدید درد اُٹھا کہ میں نے بے قرار ہو کر اپنا سینہ تھام لیا۔ میری موت پر اُنھوں نے بہت کچھ اہتمام کیا ہے، ہنس ہنس کر بہت سے پان کھائے ہیں۔ کیا وہ ہمدردی اور انسانیت کا جذبہ بھی مٹ چکا۔ یہ تو نہیں کہ وہ میرے حال سے بے خبر ہوں

میں دلہن کے کمرے کے لوٹا تو صحیح معنوں میں میرے قدم اس طرح اٹھ رہے تھے جیسے کوئی جہنم کی طرف بڑھ رہا ہو اندر آگ کی لپٹیں زور ہی سے اُسے جھلسے دے رہی ہوں۔ جب مجھ سے کہا گیا کہ میں دلہن کا ہاتھ تھام کر اُسے گھر کے اندر لے جاؤں تو میں نے پشت پر اُن کی ہنسی سُنی مڑ کر دیکھنا چاہا تو غالباً وہ وہاں سے جا چکی تھیں۔ ان کی یہ ہنسی سوئیوں کی طرح میری رگ رگ میں چبھ رہی تھی۔ میں جلد سے جلد اپنی جان چھپا کر باہر کی طرف چلا جانا چاہتا تھا کہ کہیں منہ چھپا کر دل کی بھڑاس نکالوں ممکن ہے کہ میرے آنسو ہی تھوڑی سی آگ بجھا سکیں۔ مجھے یقین تھا کہ میرا کمرہ دوستوں اور ملنے والوں سے خالی نہ ہوگا۔ کہیں بھی کوئی سکون کی جگہ نہیں۔

پھر مجھے بھائی جان کی لائبریری کا خیال آیا یقیناً وہاں کوئی نہ ہوگا۔

میں کمرے میں قدم رکھتے ہی چونکا۔ صوفے پر کوئی خاتون دروازے کی طرف سے پشت کئے ہوئے لیٹی تھیں۔ میں نے واپس ہونا چاہا۔ مگر آہٹ پا کر انھوں نے پلٹ کر دیکھا۔ میری نگاہیں ستبیں کے چہرے سے ٹکرائیں زرد اور آنسوؤں سے تر چہرہ .... میرے قدم جم گئے۔"

"ستبیں!"

انھوں نے جواب نہیں دیا بلکہ رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے ہنسنے کی کوشش کرنے لگیں پھیکی اور مردہ ہنسی!

میں نے پھر کہا۔

"ستبیں!"

اس دفعہ انھوں نے نگاہ اٹھا کر بہت غور سے میری طرف دیکھا....

.... آہ! میں نے ان کی آنکھوں میں کیا کیا دیکھا .... نہیں کچھ نہیں۔ بجھی ہوئی راکھ اور ادھوری کہانی ....

دیکھتے دیکھتے وہ آنکھیں پھر آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں ......

بہت دیر کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ کمرے سے جا چکی ہیں۔ مگر ان کی وہ خاموش رہ کر بھی بہت کچھ کہتی ہوئی نگاہیں میرے سینے میں پیوست ہیں۔

یہ نگاہیں مجھے کبھی چین نہ لینے دیں گی .... بس اسی طرح میں ہمیشہ تڑپتا اور جلتا رہوں گا۔ اور وہ نگاہیں کچوکے

لگاتی رہیں گی ....

سفر کا مقصد

زیب

ز۔ب۔

آپ نے پسندیدہ افسانے کے ساتھ ساتھ حالاتِ زندگی بھی طلب کئے ہیں۔ حقیقتاً اپنے حالات خود لکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ بقول ابراہم کاؤلے "اگر انسان برائی کرے تو اپنا دل دکھتا ہے اور تعریف کرے تو پڑھنے والوں کو برا لگتا ہے۔"

بہرحال "بزراہ امتثال امر" یہ چند سطور بھیج رہی ہوں۔

میرے والد مولوی سراج الدین احمد خاں صاحب بانی اخبار "زمیندار" نے بچپن ہی سے میری پرورش کچھ اس طرز پر کی کہ اگر میں یہ کہوں کہ اردو ادب میری گھٹی میں پڑا ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ گھر پر اخبار کی وجہ سے قطعی پڑھنے لکھنے کا ماحول تھا۔ ہر قسم کی کتابیں اور اخبار آتے رہتے تھے جنھوں نے میرے ذوقِ ادب کی تکمیل میں بڑی مدد دی۔

والد صاحب کی تربیت اور اس علمی ماحول کا اثر نہ صرف مجھ پر بلکہ کم و بیش خاندان کے ہر فرد پر پڑا۔ میری بہن ح۔ب صاحبہ نہایت اچھی شاعرہ ہیں اور بڑے بھائی جناب حامد علی خاں صاحب ہندوستان کے مشہور ادبی رسالہ "ہمایوں" کے مدیر۔

میں نے عربی۔ فارسی اور اردو کی تعلیم گھر پر اپنی والدہ محترمہ سے حاصل کی۔ اور بعد میں انگریزی خود اپنی کوشش سے سیکھی۔

مجھے اوائل عمر سے ہی کہانیاں سننے اور لکھنے کا شوق تھا۔ باقاعدہ طور پر ادبی زندگی کا آغاز "نیرنگِ فطرت" سے ہوتا ہے جو سب سے پہلی بار ہمایوں میں شائع ہوا۔ اس کے بعد متعدد افسانے ہندوستان کے مشہور ادبی رسائل میں خود میرے نام اور بعض اوقات فرضی ناموں سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ میرے افسانوں کا ابھی تک کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے اور نہ مستقبل قریب میں شائع ہونے کی کوئی امید ہے۔ اس کے علاوہ سمجھ میں نہیں آتا حالات زندگی کے سلسلہ میں کیا اور لکھوں۔ ؎

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

ذوقؔ

ریل گاڑی تیزی سے جا رہی تھی۔ دوسرے درجے کے ایک کمرے میں پانچ شخص سفر کر رہے تھے، دو مسافر جن میں ایک ذرا زیادہ باتونی اور اسی قدر لحیم شحیم تھا، اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول تھے۔ ایک دبلا پتلا نوجوان اخبار دیکھ رہا تھا اور وقتاً فوقتاً ماتھے پر بھی بل ڈال لیتا تھا، ایک نوجوان مسافر کھڑکی میں سے سر نکالے دیر سے باہر جھانک رہا تھا اور کچھ سوچ کر بعض وقت خود بخود مسکرا بھی دیتا تھا۔

ایک صاحب جنھیں ضرورت سے زیادہ دوسروں کے حالات معلوم کرنے کی عادت تھی نہایت بے تکلفی سے سب کے چہروں کا بغور معائنہ کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد خود بخود اپنے ساتھ والے باتونی کو مخاطب کرنے کی غرض سے بولے: "صاحب اب سگرٹ پرے پھینک دیجئے بہت چھوٹا رہ گیا ہے مبادا کہیں..... ہیں..... پھینک دیا؟ خوب آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"

"بھوپال"

"بخیریت"

"جی ہاں وہاں میرے ایک عزیز ہیں مسٹر عبدالغنی بی۔ اے۔ ایل ایل بی وکیل

اُن سے کچھ کام ہے۔"

"بہت بہتر" (پھر زور اور بلند آواز میں) حضرات ہم پانچ مسافر اس درجے میں سفر کر رہے ہیں اس وقت ہمیں ایک دوسرے سے جس قدر قرب حاصل ہے اُسی قدر ہمارے سفر کے مقاصد متضاد ہونگے اگر ہم میں سے کسی ایک کے لئے اس سفر کا موضوع خوشگوار ہے تو کیا معلوم دوسرے کے لئے اُسی قدر ناگوار ہو؟"

باتونی مسافر کا ساتھی: "بالکل درست! لیکن صاحب میں ایک شادی میں شریک ہونے کے لئے جا رہا ہوں۔"

"بہت خوب، میرے خیال میں سب صاحبوں کو اپنے اپنے سفر کی غرض و غایت بیان کرنی چاہیئے تاکہ ہم ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہو سکیں قوم کی ترقی کا انحصار زیادہ تر باہمی اتحاد پر ہے اور یہ اُسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہم بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے پوست کندہ حالات سے واقف ہو جائیں۔"

باتونی: "جی ہاں اور باتوں میں ذرا سفر بھی آسانی سے کٹتا ہے!"

وہی مسافر (اخبار پڑھنے والے نوجوان سے) کیوں صاحب! کہاں کے ارادے ہیں؟"

"جہاں خدا لے جائے۔"

"لیکن آخر آپ کے سفر کا کوئی مقصد بھی تو ہوگا"

"کوئی خاص مقصد تو نہیں۔"

"بس سیر و تفریح"
"تقریباً یہی سمجھ لیجئے"
نوجوان جو کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا، اسکو مخاطب کرکے "کیوں صاحب آپکو انسانوں سے نفرت ہے جو سب سے منہ موڑ کر جنگل کی طرف اس دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں؟"
نوجوان، (مسافر کی طرف پھیر کر) حضرت گو میں باہر دیکھ رہا تھا، لیکن آپ کی سب باتیں بغور سن چکا ہوں (مسکرا کر) اور مجھے معلوم ہو گیا کہ رنج و راحت کا شریک بننے کے لئے اب آپ میرے "پوست کندہ حالات" معلوم کرنے پر تلے ہوئے ہیں لیکن افسوس کہ فی الحال مجھے کوئی رنج نہیں لیکن اگر آپ صرف میری راحت میں شریک ہونا چاہیں تو میں بسر و چشم حاضر ہوں میرے سفر کا موضوع خوشگوار ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک پر لطف بھی ہے۔"
قہی صاحب۔ "ٹھہریئے کہیں آپ مرزا امجد علی صاحب مرحوم کے صاحبزادے شمیم تو نہیں ہیں"
نوجوان: "آپ کا خیال درست ہے"
قہی صاحب "ارے شمیم تم مجھے پہچانتے نہیں، میں عبدالغفار ہوں، علیگڈھ میں میں نے تمہارے ساتھ انٹرنس کا امتحان دیا تھا۔
شمیم۔ (کچھ سوچ کر) خوب آپ غفار ہیں، لیکن اب آپ موٹے بہت ہو گئے ہیں۔ تاہم آپکی آواز ابھی موٹی نہیں ہوئی۔ کیونکہ مجھے گوش آشنا معلوم ہو رہی تھی۔"
عبدالغفار "ارے بھائی تم بھی تو بالکل بدل چکے ہو، زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہاں تو پلیٹ فارم پر میں نے تمہارے ہمراہ ایک تشریف پردہ نشین خاتون کو بھی دیکھا تھا وہ کون تھیں بھائی؟"
شمیم "وہ خاکسار کی بیوی تھیں۔"

عبدالغفار:۔ کیا شادی ہو چکی ہے؟"
شمیم ۔(مسکرا کر) "جی ہاں"
عبدالغفار:۔ "کس خاندان ہیں؟"
شمیم:۔ "میرے خسر خان بہادر مرزا الطاف علی صاحب کا نام تو آپ نے سنا ہوگا؟"
عبدالغفار۔ اجی وہ تو میرے ہم وطن ہیں —— ارے دوست تم تو قسمت کے بہت دھنی نکلے۔ کیا شادی بھی کر چکے ہو؟"
شمیم۔ پہلے اپنے ہوش و حواس درست ہو لینے دیجئے۔ پھر بات کریں گے۔
عبدالغفار۔ نہیں بھائی میرا خیال دوسری طرف تھا، لیکن بھئی تم نے کمال کر دیا۔
شمیم (ہنستے ہوئے) تو جناب کیا میرا زوال چاہتے تھے؟
عبدالغفار۔ خدا نہ کرے اچھا بھئی وہ تم نے کیا کہا تھا کہ "میرے سفر کا موضوع خوشگوار ہی نہیں بلکہ پر لطف بھی ہے"
شمیم:۔ "یہ ایک طویل داستان ہے۔
عبدالغفار۔ اور ہمیں اس سے محروم رکھنے کی وجہ؟
شمیم:۔ کوئی نہیں، میں تو کسی زندہ دل فرد بشر کو یہ افسانہ سننے سے محروم رکھنا نہیں چاہتا۔ صاحب اس کی "عملی تصنیف" کے لئے میں نے سخت محنت اور جانفشانی کی ہے اور اب اس کی تشریح کرنا میرے لیے کچھ دشوار نہیں بلکہ مسرت خیز ہے۔
پہلے باتونی صاحب۔(جو اپنے ساتھی سے لگاتار باتیں کرنے کے باوجود شمیم کی تمام باتیں بھی سُن رہے تھے) لیکن صاحب افسانے سے لطف اندوز ہونے کی حقدار تو تمام پبلک ہوتی ہے۔

شمیم ۔ آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے، میں آپ کی تائید کرتا ہوں

باتونی صاحب کا ساتھی ۔ پھر تو ہمیں بھی اپنی نشست چھوڑنا پڑی ۔

شمیم ۔ اس قصہ کا ہیرو چونکہ خود میں ہوں، اس لئے اپنے متعلق چند ابتدائی حالات سے اپنے آپکو واقف کردینا ضروری ہے ۔ میرے والد مرزا مجید علی صاحب مرحوم تعلقدار میرے لڑکپن ہی میں انتقال فرماگئے تھے اور اپنی والدہ مرحومہ کی تو میں صورت سے بھی ناآشنا ہوں ۔ میں اکلوتا بیٹا تھا والد مرحوم نے میرے لیے اسقدر جاگیر اور نقد ترکے میں چھوڑا کہ آجتک بفضل خدا مجھے کبھی روزگار کے لئے پریشان نہیں ہونا پڑا ۔ انکی وصیت کے مطابق میں نے تعلیم پائی ۔ اور ایم ۔ اے کرلینے کے بعد سوائے اپنی جائداد کا معمولی انتظام کرنیکے مجھ پر کوئی خاص بار نہیں پڑا بیکاری کی گھڑیوں کو پرلطف بنانے کے لئے میں نے اور میرے ہی جیسے چند بے فکر دوستوں نے ایک انجمن قائم کرلی جس کے ہر رکن کا فرض تھا ۔ کہ وہ کوئی ایسا انوکھا مذاق کرے جسکی نظیر مشکل ہو بعض وقت پبلک کی مروہ دلی اور حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی کو روکنے کے خیال سے عام لوگوں کو مفت مذاقیہ ڈراموں سے محظوظ کیا جاتا ہماری انجمن کو اگر کسی سے دشمنی تھی، تو وہ صرف رنج و الم تھا ۔ اگر کبھی کوئی رکن کسی وجہ سے ملول ہوجائے تو اسے فوراً انجمن سے نکال دینے کی دھمکی دیجاتی اداس آدمی ہماری انجمن میں بمنزلہ ایک زہریلے جرثومے کے سمجھا جاتا تھا جو غم کی لاگ سے مسرت کو تباہ کردینے والا ہو، ہر رکن کو نئے نئے مذاق کرنے کے لئے بعض وقت سخت کوفت اٹھانی پڑتی ۔ لیکن جب شام کیوقت سب ارکان میرے ایک بنگلے پر جو محض اسی لئے مخصوص تھا، جمع ہوکر اپنے اپنے کارہائے نمایاں بیان کرتے تو یہ پرلطف گھڑیاں ساری کوفت بھلادیتیں، اسی طرح ایک شام (اب اخبار پڑھنے والے

مسافر کی دلچسپی بھی اخبار سے کم ہونے لگی، اس نے ایک نظر بھر کر شمیم کو دیکھا۔ پھر بظاہر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ ہم سب جمع تھے اور ایک دلچسپ واقعے پر تنقید ہو رہی تھی جو اسی روز پیش آچکا تھا۔ میرے عزیز دوستوں میں سے ایک نے لمبی داڑھی لگا کر اور سبز چوغہ پہن کر جمعہ کی نماز کے بعد مسجد میں وعظ کیا تھا۔ آپ نے وعظ کے دوران میں قوم کے یتیم و بیکس بچوں اور بیواؤں کی وہ حالت زار بیان کی کہ تمام بھولے بھالے سامعین پر رقت طاری ہو گئی خود حضرت کی ریش مبارک بھی آنسوؤں سے تر تھی، اس کے بعد پھر ادھر چندہ جمع ہونا شروع ہوا بعض فاقہ مست اصحاب نے تو جیبیں ہی خالی کر دیں۔ میرا یہ دوست پہلے ہی اس شام اپنے دوستوں کو ایک پر تکلف دعوت کیلئے مدعو کر چکا تھا لیکن کسی کو ہرگز یہ معلوم نہ تھا کہ دعوت کے واسطے روپیہ فراہم کرنے کے لئے یہ صورت عمل اختیار کی جائیگی۔ میں اس روز کسی وجہ سے دعوت میں شریک نہ ہو سکا لیکن میرے دوسرے عزیز دوست نے بھی بلا وجہ دعوت میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ اور جب میزبان صاحب اپنے دوستوں کے ہمراہ ایک ہوٹل میں بیٹھے قسم قسم کے نفیس کھانے تناول فرما رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ گزرے ہوئے قصے کو نمک مرچ لگا کر بیان کئے جا رہے تھے تو میرا وہ دوست پولیس افسر کا بھیس بدل کر کچھ اپنے ہی جیسے سپاہیوں کے ہمراہ ان کے سر پر پہنچ گیا سب سے پہلے ہتھکڑی میزبان کو لگ گئی اور مہمان بھی زیر حراست لے لئے گئے، اس کے بعد مصنوعی پولیس افسر صاحب اور انکے سپاہیوں نے ڈٹ کر وہ دعوت اڑائی اور بعد میں ایک قہقہہ لگا کر تمام بھرم کھول دیا۔

مجھے جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو اس میں اپنے شریک نہ ہو سکنے کا بہت افسوس ہوا لیکن اسی وقت میں نے عہد کر لیا کہ اب ایک اس سے بھی بڑھ کر پر لطف ڈرامہ کیا جائے

اسکا پلاٹ میں مدت سے سوچ رہا تھا اور اس کی ابتدا دوسرے ہی دن ہو گئی۔

احباب میں اکثر میری شادی کے متعلق چرچا ہوتا رہا۔ لیکن میں ہمیشہ یہی جواب دیتا کہ ہندوستان کا موجودہ طریق ازدواج مجھے پسند نہیں جب شادی کا مفہوم ہی خوشی ہے تو کیوں نہ اسکے لئے ایسا طریق عمل اختیار کیا جائے جس سے وہ حقیقی معنوں میں شادی کہلا سکے۔

خان بہادر مرزا الطاف علی صاحب میرے والد مرحوم کے آشناؤں میں سے تھے۔ اسوقت تک مجھے خود ان سے کبھی شرف نیاز حاصل نہ ہوا تھا تاہم میں اسقدر جانتا تھا کہ وہ ایک زندہ دل، روشن خیال، نیک خو بزرگ ہیں اور والد کی دلی خواہش تھی کہ میرا رشتہ انھیں کے گھر لانے میں کیا جائے لیکن موت نے انھیں کچھ مہلت نہ دی۔

میں نے چند خاص دوستوں کو اپنا ہمراز بنا کر اپنی جائداد وغیرہ کا انتظام اُن کے سپرد کیا اور اُنھیں اپنا آئندہ نظام عمل اچھی طرح سمجھا کر کہدیا کہ میری غیر حاضری کی کوئی خاص وجہ مشہور نہ ہو، مجھے کسی لمبے چوڑے سامان سفر کی ضرورت نہ تھی اپنے دوستوں سے رخصت ہو کر میں دوسرے دن خان بہادر مرزا الطاف علی (اپنے خسرا) کی خدمت میں جا حاضر ہوا۔ لیکن حضرات سنیئے اسوقت میں اس حالت میں نہ تھا کہ جو آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں۔ میرے کپڑے پھٹے ہوئے اور غلیظ تھے میرے پاؤں ننگے تھے میرے منہ پر اور بالوں میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو منوں مٹی اور گرد جمی ہوئی تھی سب سے پہلے مرزا صاحب کے نوکروں نے میری تواضع کی، کسی نے فقیر سمجھ کر گالیاں دیں، کسی نے ایک چپت رسید کیا لیکن ہم کہاں ٹلنے والے تھے۔

اب اخبار پڑھنے والا مسافر بھی اپنی جگہ چھوڑ کر قریب کی ایک نشست پر آ کر بیٹھ گیا ماتھے پر اب کوئی بل نہ تھا، چہرے سے مسکراہٹ نمودار تھی۔

اتنے میں مرزا صاحب کی سب سے چھوٹی صاحبزادی جس کی عمر تقریباً پانچ یا چھ سال کی تھی ادھر آنکلی مجھے نوکروں کے ہاتھوں عاجز آئے ہوئے دیکھ کر دوڑتی ہوئی مرزا صاحب کے پاس گئی۔ اور میری حالت زار کا نقشہ اُن کے سامنے پوری طرح کھینچکر دکھا دیا مرزا صاحب کا ایک نوکر ایک بڑا سا کتا جو کچھ دور بندھا ہوا تھا مجھ پر چھوڑنے کے لیے کھول ہی رہا تھا کہ وہ بچی کا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر تشریف لائے۔ نوکروں کو خوب ڈانٹا۔ پھر جیب سے ایک دو نی نکال کر میری طرف مخاطب ہوئے "لو میاں اس دروازے سے بھاگ جاؤ"

میں نے ذرا کھنکار کر کہا "سرکار میں فقیر نہیں ہوں"

مرزا صاحب کا ہاتھ وہیں رُک گیا۔ پھر میرے چہرے پر ایک گہری نگاہ ڈال کر بولے "کہاں سے آئے ہو؟" میں نے جواب دیا "سرکار مجھے نوکری کی تلاش ہے حضور کی بڑی تعریف سنی تھی کہ آپ غریبوں کی دستگیری فرماتے ہیں۔

مرزا صاحب۔ ہمیں تو فی الحال شاید کسی نوکر کی ضرورت نہیں۔

میں "تو جناب پھر میں کہاں جاؤں"

مرزا صاحب۔ (کچھ سوچ کر)۔ اچھا ٹھہرو تم کیا کام کر سکتے ہو؟

میں۔ جناب خدا نے ہاتھ پاؤں دیئے ہوں تو انسان جو کام چاہے کر سکتا ہے۔

مرزا صاحب۔ اچھا اندر کے کام کیلئے ایک آدمی کی ضرورت ہے، ماما کو برتن صاف کر دیا کرو گے۔ اور بیگمات جو کام بتائیں مثلاً بازار سے کوئی سودا وغیرہ منگانا ہو۔ تو ....

میں۔ بہت بہتر سرکار! برتن صاف کرنا تو میرا کام ہی ہے اور بازار سے سودا خریدنا بھی میں خوب جانتا ہوں۔

مرزا صاحب۔ کیا تنخواہ لو گے؟

میں۔ جو حضور عنایت فرمائیں

مرزا صاحب۔ فی الحال چھ روپیہ اور کھانا تمھیں منظور ہے؟

میں۔ سرکار میرے لیے یہ بھی زیادہ ہیں۔

مرزا صاحب۔ (ہنس کر) زیادہ ہیں

میں۔ جی ہاں، پہلے جہاں ملازم تھا، وہ صاحب پانچ ہی روپے دیا کرتے تھے۔

مرزا صاحب۔ تمھارا نام کیا ہے؟

میں۔ جو کچھ حضور تجویز فرمائیں۔

مرزا صاحب۔ خوب، نام تو تمھارے ماں باپ نے رکھا ہوگا یا آج ہم تجویز کریں۔

میں۔ سرکار میرے ماں باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ اب جو کسی کا جی چاہے اُسی نام سے پکار لیتا ہے

مرزا صاحب۔ آج کل لوگ تمھیں کس نام سے پکارتے ہیں

میں۔ جناب مجھے شمّو کہتے ہیں

مرزا صاحب۔ شمّو؟ اصل نام کیا ہے شمس الدین؟

میں۔ جی نام تو کئی بنجاتے ہیں، شمس الدین بھی شمیم بھی۔

مرزا صاحب۔ تمھیں کون سا نام پسند ہے

میں۔ سرکار سچ پوچھیں تو شمّو شمیم ہی سے بگڑ کر بنا ہے۔ لیکن پہلے صاحب کا نام خود بھی شمیم تھا۔ اسلئے انھوں نے مجھے ایکدن دوستوں کے سامنے اپنا پورا نام ظاہر کرنے پر خوب زدوکوب کیا۔ اس روز سے اپنا نام بتاتے ہوئے ڈرتا ہوں۔

مرزا صاحب نے ایک قہقہہ لگایا۔ "اچھا یہ بات ہے غالباً اسی وجہ سے

انھوں نے تمھیں نکال بھی دیا"

میں۔ جی نہیں میں خود ہی چلا آیا۔

مرزا صاحب۔ تمھارے ماں باپ کون تھے۔

میں۔ حضور میں نے انھیں دیکھا نہیں

مرزا صاحب۔ سنا تو ہوگا۔

میں۔ جناب سُنا ہے کہ وہ ذات کے مغل تھے اور بڑے شریف تھے۔

مرزا صاحب۔ خوب، مغل تو ہم بھی ہیں۔

میں۔ تو جناب پھر وہ کچھ اور ہوں گے۔ مجھے اچھی طرح معلوم نہیں۔

مرزا صاحب۔ نہیں نہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ بجز ہمارے اور کوئی مغل نہیں ہو سکتا قسمت کے پھیر ہیں، تم شکل و صورت سے ایک شریف آدمی معلوم ہوتے ہو لیکن فلاکت نے تمھارا حال ابتر بنا رکھا ہے چلو اندر بیگم صاحبہ کے پاس، دراصل تم انھیں کے ملازم ہو، انھیں اپنی ضرورت کی چیزیں منگانے کیلئے ایک آدمی کی ضرورت ہے۔

میں نے "بہت بہتر" کہا اور مرزا صاحب کے پیچھے پیچھے ہو لیا مرزا صاحب کی اہلیہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھیں، انھیں آتے دیکھ کر بیٹھ گئیں، میں آداب بجا لایا وہ میری طرف دیکھ کر ذرا حیران ہوئیں لیکن جلد ہی مرزا صاحب نے انھیں سارا واقعہ کہہ سنایا، اب وہ خوش معلوم ہوتی تھیں، میری طرف مخاطب ہو کر بولیں "ادئی تمھارا کیسا موئے بھاگ منگوں کا سا حال بنا ہے۔ جاؤ تو ذرا اپنے کپڑے بدل کر آؤ۔"

میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر نگاہ نیچی کر لی اور خاموش رہا۔

مرزا صاحب نے کہا "اسے میرے دُھلے ہوئے کپڑوں میں سے پہننے کیلئے

کپڑے دیدو۔" میری باچھیں کھِل گئیں۔ چہرے سے یوں ظاہر کیا، جیسے کبھی دُھلے ہوئے کپڑوں کی شکل بھی نہ دیکھی ہو۔ بیگم صاحبہ نے بڑی محنت سے مرزا صاحب کے سب کپڑوں میں سے ڈھونڈ کر جو کپڑے نکالے تھے نکال کر مجھے لا دیئے میں نے سلام کر کے لے لیئے اور نہانے کیلئے کسی مسجد کی تلاش میں نکل گیا مجھے دو تین گھنٹے باہر ہی لگ گئے کیونکہ تمام واقعات حسب وعدہ اپنے دوستوں کی ضیافت طبع کیلئے ان کو لکھ کر بھیجنے تھے۔

جب میں گھر آیا تو بیگم صاحبہ مع اپنی تینوں صاحبزادیوں کے چاء پی رہی تھیں مرزا صاحب کی بڑی لڑکی خورشیدہ کی شادی ہو چکی تھی۔ لیکن ان کے شوہر ابھی ولایت میں بیرسٹری کے لئے گئے ہوئے تھے اس لیے وہ بھی اکثر یہیں رہتی تھیں۔ منجھلی قمر جو اسوقت میرے ساتھ سفر کر رہی ہیں ناکتخدا تھیں۔ اور تیسری ابھی بچی ہی تھی، سب سے بڑا لڑکا ایم۔ اے میں تعلیم پا رہا تھا اور دوسرا ابھی انٹرنس کی تیاری میں مصروف تھا۔ بڑی صاحبزادی کے دو خورد سال بچے بھی تھے۔

میں بیگم صاحبہ اور اُن کی صاحبزادیوں کے سامنے آداب بجا لایا۔ بیگم صاحبہ میرے دیر لگا کر آنے سے سخت برہم ہو گئی تھیں، اتنے میں مرزا صاحب بھی باہر سے آ گئے اور بولے بیگم! میں نہ کہتا تھا کہ وہ بڑا ہی بھلا اور شریف لڑکا ہے۔ دھوکا نہیں کریگا۔ آخر آ ہی گیا۔

بیگم صاحبہ نے آہستہ آہستہ منہ میں کچھ کہا۔ اور پھر میری طرف مخاطب ہوئیں "کیا نام شمو؟ میں آج تجھے معاف کرتی ہوں۔ اس کے بعد پھر کبھی تو نے اسطرح باہر دیر کی تو نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا۔"

میں نے کہا "بیگم صاحبہ! مسجد ہی کوئی نہیں ملتی تھی، تلاش کرتے کرتے دیر ہو گئی۔"

بڑی لڑکی بولی "اماں ابھی یہ نیا نیا ہمارے شہر میں آ رہا ہے۔ ابھی اسے یہاں

کوئی ایسی واقفیت تو ہوگی نہیں" —— قمر بولی "بعض وقت آدمی سے بھول بھی ہو جاتی ہے"۔

تھوڑی دیر کے بعد بیگم صاحبہ پھر خوش ہو گئیں۔ مرزا صاحب مجھے مخاطب کرکے بولے "شمّو اب تو تم صاحب بہادر معلوم ہوتے ہو"

میں مسکرانے لگا۔

مرزا صاحب لیکن منہ دھونا تمھیں ابھی تک نہیں آیا۔ دیکھو ابھی تک منہ پر مٹی لگی ہے میں۔ سرکار آہستہ آہستہ سب کچھ سیکھ جاؤنگا" اس پر تینوں خاتونیں ہنس پڑیں۔

اب میری زندگی ایک عجیب پر لطف طریقے سے بسر ہونے لگی سارا دن ماما مجھ سے برتن وغیرہ صاف کراتی اور ساتھ ہی ساتھ اپنا رعب جتانے کے لئے خوب ڈانٹ بتایا کرتی، جو ذلیل اور ادنیٰ کام ہوتا، نوکر غریب اور بے وطن جانکر مجھ ہی سے کراتے۔ ادھر میں باہر نکلتا تو نوکروں کے سامنے اور بھی بیوقوف اور بھولا بھالا بن جاتا ماما کی ڈانٹ اسطرح برداشت کرتا۔ جیسے وہی میری اصل مالکہ ہے۔ ادھر آہستہ آہستہ میں نے بیگم صاحبہ کے دل میں خوب شفقت کی جگہ لے لی، پہلے ہی دن جب نمونے کے طور پر انھوں نے مجھ سے کچھ کپڑا منگایا تو میں نے اپنی گرہ سے زیادہ قیمت دیکر ان سے بہت کم دام لئے اس پر وہ بیحد خوش ہوئیں اور اُس روز تمام نوکروں کو خوب ڈانٹ ہوئی۔ کہ تم سب بے ایمان ہو میں نے جب یہ دیکھا تو چند دن بعد پھر ایک خوبصورت سا برتن تین روپیہ میں بازار سے خرید لایا۔ اسکی بیگم صاحبہ کو ضرورت تھی، بیگم صاحبہ دیکھکر خوش ہوگئیں اور بولیں "ارے شمّو! یہ کہاں سے ملا" میں نے کہا "سرکار بازار سے لا رہا ہوں" بیگم صاحبہ "کیا قیمت ہے اس کی؟"

ہیں دو سرکار نو روپے"
بیگم صاحبہ۔ اوئی توبہ یہ ماما مردار ابھی آٹھ دن نہیں ہوئے اسکی قیمت تین روپے تبا رہی تھی، جا تو اسکے ساتھ لے جا اور اسکے سامنے ایک اور ایسا برتن خرید کر لے آ"

میں ذرا پریشان ہوا لیکن جلد ہی بولا "سرکار دکاندار دکان بند کر کے ابھی ابھی کہیں چلا گیا تھا" بیگم صاحبہ نے ماما کو بلا کر خوب ملامت کی۔ کہ تو ہمیں دھوکا دیکر ایک روپیہ ہضم کرنا چاہتی تھی" ماما مجھ پر دانت پیسکر بڑبڑاتی ہوئی واپس چلی آئی "نہ جانے موئے ماری کاٹا کس کا گھر لوٹ کر لے آتا ہے"

جب مرزا صاحب نے دیکھا کہ میں انکے سوٹ سلیقے سے تہ کرنا، اور سنبھالنا ہوں تو وہ اپنا کام مجھ سے نہایت شوق سے کرانے لگے۔ ماما کو منع کر دیا کہ مجھ سے برتن نہ صاف کرایا کرے لیکن وہ کب مانتی تھی، میں بھی جب موقع ملتا اسے بلا چون وچرا برتن صاف کر دیتا۔ اب گھر کے بچے بچے کو مجھ سے دلچسپی ہو گئی، بچے کہتے تھے کہ تمو کے ساتھ ہی سیر کو جائیں گے، بیگم صاحبہ کہتیں بس میں اپنے کام سوائے تمو کے کسی سے نہ کراؤنگی سب نوکر بدتمیز اور بے ایمان ہیں، مرزا صاحب چاہتے تھے کہ تمو صرف میری خدمت میں رہے۔

دونوں لڑکیاں چاہتی تھیں کہ تمو اپنے گزشتہ (من گھڑت) واقعات ہی بیان کرتا رہے کیونکہ مجھے باتوں کو مذاق کے پیرایہ میں بیان کر لینے پر خاص قدرت حاصل تھی میں بھی حتی المقدور ہر شخص کو خوش رکھنے میں کسر نہ اٹھا رکھتا۔ کیونکہ ہماری انجمن میں ہر قسم کی محنت برداشت کر لینا ہی سب سے بڑی فضیلت قرار دی گئی تھی۔

ایک دن باورچی خانہ میں بیٹھا برتن صاف کرنے میں مشغول تھا کہ اتنے میں

وہاں قمر آگئیں۔ میرے میلے کچیلے کپڑے دیکھ کر کہا "شمیم اگر کوئی شخص تمہاری باتیں سنے تو کہے کہ تم ایک گریجویٹ سے کسی طرح کم نہیں لیکن اگر تمہارے کپڑوں کو دیکھے تو کبھی تمہارے ہاتھ کے صاف کئے ہوئے برتنوں میں کھانا بھی کھانا گوارا نہ کرے۔"

میں نے کہا "بی بی باتیں کرنا تو میرے اختیار میں ہے اگر کپڑے پہننے بھی اسی طرح اختیار میں ہوتے تو آپ دیکھتیں کہ میں کیسے اچھے کپڑے پہنتا" قمر نے سادگی سے کہا "کپڑے نہیں ہیں تو ابا سے لے کر پہن لو" اسکے بعد وہ چلی گئیں مجھے ایک شرارت سوجھی، دوستوں نے خراب اور پرانے ٹرنک میں ایک دو سوٹ رکھ کر ضرورت کے وقت پہننے کیلئے میرے پاس بھجوا دیئے تھے۔ اپنی کوٹھری میں چپکے سے جا کر میں نے ایک سوٹ نکالا (جو بالکل مرزا صاحب کے ایک سوٹ سے مشابہ تھا) اور پہن لیا۔ کالر ٹائی وغیرہ درست کر کے پھر اپنی جگہ پر آکر برتن صاف کرنے لگا۔ اتنے میں ماما باہر سے آگئی میری ادھر پشت تھی، اسے شاید مرزا صاحب کا دھوکا ہو گیا بے اختیار اسکے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اسکی آواز سنکر قمر، انکی بڑی بہن اور بیگم صاحبہ بھی آگئیں، پہلے تو سب حیران ہوئے لیکن جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو سب کا مارے ہنسی کے برا حال تھا قمر نے ساری بات جو پہلے ہو چکی تھی بیگم صاحبہ کو سنائی، کچھ دیر میری اس قطع وضع اور برتن مانجھنے پر ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ اسکے بعد بیگم صاحبہ کو سوٹ کا خیال آیا۔ بولیں "بد بخت مرزا صاحب اپنے سوٹ کا یہ انجام دیکھیں تو تجھیں کاٹ ہی ڈالیں۔ جا۔ انکے آنے سے پہلے پہلے اتار کر رکھ دے" میں نہایت فرمانبرداری سے اٹھا اور اپنا سوٹ اتار کر پھر اپنے صندوق میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ بعد میں میں نے دونوں لڑکیوں کو آپس میں باتیں کرتا سنا۔ خورشید بولیں "توبہ یہ شمو کیسا شریر نکلا۔ ابا جان کو کپڑے پہنتے

دیکھا کیسے اس نے بالکل اسی طرح پہن لیے جیسے مردار کا لباس ہی یہی ہے"
قمر۔ خیر ابا کو پہنتے تو سبھی نوکر دیکھتے ہیں، میرے خیال میں تو یہ غیر معمولی طور پر ذہین ہے اگر بچپن میں اسکے ماں باپ نہ مر جاتے۔ جو واقعی کوئی شریف لوگ ہونگے تو ضرور یہ بیچارہ بہت ترقی کرتا"
خورشید۔ اس کا حوصلہ تو دیکھو ہم سے ذرا بھی نہیں کہ ابا کے کپڑے اسے پہنے ہوئے دیکھ کر ہم خفا ہوں گے
قمر۔ دانا ہے نا۔ وہ ہمارے مزاج کو خوب سمجھ گیا ہے۔ کہ کس بات پہ ہم ناراض ہوتے ہیں اور کس پر خوش، میرے خیال میں حد سے زیادہ خوف کھانا بھی احمقوں کا کام ہے۔ دوسرے ابا جان بھی تو اس پہ خاص شفقت کی نظر رکھتے ہیں۔ انھیں تو خاص طور پہ زندہ دل آدمی ہی پسند ہیں دیکھئے کبھی تو ابا مجھ سے ناراض ہوا کرتے ہیں کہ تم بہت جلے دل والی ہو، اور خورشید اچھی ہے جو ہنس مکھ تو ہے
خورشید۔ لیکن ایک بات یہ بدبخت کسی طرح نہیں سمجھتا کہ ہمیں گندے کپڑوں سے نفرت ہے۔ ابا بھی بہت چاہتے ہیں کہ یہ صاف رہا کرے۔
قمر۔ ہاں اس پہ مجھے بھی تعجب ہے۔

چند روز بعد ایک اور اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ مرزا صاحب کے یہاں کوئی اجنبی مہمان ان سے ملنے کیلئے آئے۔ اچھے تاکید ہوئی کہ سوائے تمھارے کوئی شخص چائے لیکر نہ آئے، اور مرزا صاحب نے یہ بھی کہا کہ ذرا اچھے کپڑے پہنکر چائے لانا" اب اماں تو چائے تیار کرنے لگی اور میں نے صابن لیکر اچھی طرح منہ ہاتھ اور پاؤں وغیرہ دھوئے اند اس سے کہا چائے کشتی میں رکھ کر میری کوٹھری کے سامنے رکھدے۔ میں کپڑے

۱ پہن کر بے جاؤں گا۔ ادھر میں نے پھر اپنا وہی سوٹ اور مرزا صاحب کا ایک بوٹ پہنا۔ چائے کی کشتی اٹھائی اور اس کمرے میں داخل ہوا، جہاں مرزا صاحب تھے۔ مہمان نے جب ایک معزز شخص کو چائے کشتی اٹھا کر آتے ہوئے دیکھا تو ہچکچا سے گئے مجھ سے کشتی پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا میں نے مجبوراً مصافحہ کیا۔ وہ ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولے "تشریف رکھیے" میں بیٹھ گیا مگر مرزا صاحب کے سامنے آنکھ نہ اٹھا سکتا تھا۔ وہ بار بار مہمان سے نظر بچا کر مجھ پر قہر آلود نگاہیں ڈالتے۔ لیکن میں نے ہاں شرمیلی نگاہ نیچی رکھی۔ مہمان نے تواضع چائے کی پیالی میرے آگے بڑھا دی اور وہ مجبوراً مجھے پینا پڑی۔ مرزا صاحب کے غیظ و غضب کا بھی مجھے اندازہ تھا۔ اور میں دل ہی دل میں لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مہمان نے چائے پیتے ہوئے مجھ پر ایک شفقت کی نگاہ ڈالی اور مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔ "صاحبزادہ کہاں تعلیم پاتے ہیں؟" مرزا صاحب نے سنی ان سنی ایک کر کے کوئی اور ذکر چھیڑ دیا۔ بزرگ مہمان کی شفقت مجھ پر برابر جاری تھی۔ کبھی بسکٹ میری طرف بڑھاتے اور کبھی کیک کھانے کے لئے کہتے۔ میں نہایت متانت سے سب کچھ کھائے جاتا۔ مرزا صاحب کو مجھ پر اس وجہ سے اور بھی غصہ آتا۔ کہ ان کے معزز مہمان مجھے ان کا بیٹا سمجھ رہے تھے اور میں پہلے تو چائے خود اٹھا کر لایا دوسرے اب اُلّو کی طرح بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ مہمان کے ہر سوال کا جواب میں نہایت شرمیلے انداز میں ٹھہر ٹھہر کر دیتا تھا۔ مرزا صاحب کے مارے گھبراہٹ اور غصے کے بات کرنی دشوار ہو رہی تھی۔ ایک مرتبہ انھوں نے مہمان کی کسی بات کا ایسا الٹا جواب دیا کہ بے اختیار مجھے ہنسی آگئی۔ جوں توں کر کے چائے ختم ہوئی۔ میں فوراً اٹھا اور سب چیزیں سمیٹ سلام کر کے دروازے تک آیا۔ ایک

لمحے کے لیے میں رکا۔ اور پھر دہلیز میں بیٹھ کر کیاب کے بچے کھچے ٹکڑے کھانے شروع کیے اب مرزا صاحب کا غصہ آخری درجہ تک پہنچ چکا تھا مجھ پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی اور بے اختیار انکے منہ سے کوئی سخت کلمہ نکل گیا

مہمان (یہ سمجھ کر کہ مرزا صاحب نے ان سے کوئی بات کی ہے) "کیا ارشاد فرمایا جناب نے؟"

اب مجھ میں مرزا صاحب کا جواب سننے کی تاب نہ رہی۔ فوراً کشتی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد غالباً مہمان تو رخصت ہوا اور مرزا صاحب اندر آئے۔ میں کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے اب چائے کے برتن صاف کر رہا تھا مرزا صاحب نے آتے ہی نہایت پُرغضب لہجے میں مجھے آواز دی "شمو!"

میں جلدی سے ہاتھ دھو کر سامنے جا کھڑا ہوا مرزا صاحب نے چھچی لے کر تڑا تڑ مجھ پر برسانی شروع کیں۔ ساتھ ساتھ کہتے جا رہے تھے "ملعون! گستاخ اب تو حد سے بڑھ چلا ہے آج تو نے ایک معزز شخص کے سامنے مجھے بہت خفیف کیا۔ چل یہاں سے دور ہو۔ نکل جا اور آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔"

میں مرزا صاحب کے پاؤں پر گر گیا اور کہا۔ سرکار آج کی خطا معاف کر دیجیے۔" انھوں نے مجھے بوٹ کی ٹھوکر سے پرے دھکیل دیا۔ اتنے میں بیگم صاحبہ بھی آگئیں۔ مرزا صاحب نے مجھے چھوڑ دیا۔ اور سارا حال ان سے کہا۔ بیگم صاحبہ کو سنکر ہنسی آگئی۔ لیکن انھوں نے فوراً ہی منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ انھیں معلوم تھا کہ مرزا صاحب کو اول تو غصہ آتا ہی نہیں اور اگر آجائے تو پھر کسی طرح رکتا بھی نہیں۔ یہ بات سارے گھر میں مشہور ہو گئی۔ اور مرزا صاحب سے پوشیدہ ہر شخص ہی ہنستا تھا۔

شام کے قریب جب مرزا صاحب کا غصہ ذرا ہلکا ہوا۔ تو میں نے سنا کہ بیگم صاحبہ انھیں سمجھا رہی ہیں "آپ نے خواہ مخواہ اس یتیم بچے پر ظلم کیا۔ وہ تو سارا دن ہنسی مذاق سے ہم لوگوں کو خوش کیا کرتا ہے، بازار سے چیزیں لا دیتا ہے اور دوسروں سے دگنی چیز لاتا ہے ایسا نوکر ہمیں کبھی نہ ملے گا۔ ہر کام سلیقہ اور صفائی سے کرتا ہے کہ کیا بتاؤں۔ جانے کس شریف کی اولاد ہے اور یتیم ہو کر ایسی سختیاں اٹھا رہا ہے"

مرزا صاحب بھی اب زیادہ خفا نہ تھے بولے "اور تو خیر کوئی بات ہوئی ہم تو اس کے سوٹ پہننے کی داد دیں گے مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ کمبخت اسقدر ذہین ہے۔ لیکن اسوقت سوٹ پہن کر آنے کا موقع بالکل نہ تھا۔"

بیگم صاحبہ نے کہا "وہ بیچارہ موقع بے موقع کیا جانے۔ غریب پر رحم کرنا ہی چاہیے۔ ہم بھی بچوں والے ہیں"

تھوڑی دیر بعد مرزا صاحب نے مجھے آواز دی "شمو، ادھر آؤ" میں فوراً دست بستہ حاضر ہوا۔

مرزا صاحب: شمو! تمھیں کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟

میں: جی بالکل نہیں۔

مرزا صاحب: اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟ آیندہ بھی ایسی شرارت کرو گے۔

میں: حضور میری مجال نہیں شرارت کرنے کی۔

مرزا صاحب: معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنے قصور سے شرمسار ضرور ہو۔؟

میں نے نیچی نگاہ کر لی اور شرمندگی کے انداز میں مسکرانے لگا۔

مرزا صاحب: (جیب سے پانچ روپے نکال کر) لو یہ تمھیں دودھ کے لیے دیئے

جاتے ہیں۔

میں۔ سرکار، پانچ روپیہ کا دودھ کیا ہوگا؟"

مرزا صاحب۔ (مسکرا کر) یہ نہیں معلوم نہ تھا کہ تم پانچ روپیہ کا دودھ ایک وقت خریدنا چاہتے ہو۔

بیگم صاحبہ۔ (جلدی سے تین روپیہ اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے) لے شموّا بس اب چپ رہ (مرزا صاحب کو مخاطب کر کے) بڑا بیرچشم لڑکا ہے"

میں سلام کر کے مسکراتا ہوا اپنی جگہ پر واپس آ گیا۔

عام طور پر گھر کے ملازموں کی عادت تھی کہ جب کبھی میرے پاس کوئی روپیہ وغیرہ دیکھتے، خواہ میری تنخواہ ہی سے ہو، مجھے بھولا بھالا اور بیوقوف سمجھ کر فوراً اسے اڑانے کے لئے حیلے بہانے تراشنے لگتے چنانچہ اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوا۔

سب سے پہلے جو شخص باہر ڈیوڑھی پر ملازم تھا۔ نہایت مغموم صورت بنا کر میرے پاس آ بیٹھا۔ اور بولا "آج گھر میں کچھ نہیں پکا، فاقہ ہے"

میں۔ کیوں بھائی کیا بات ہے جو ایسے ہی فاقوں پہ نوبت آ گئی؟

وہی ملازم۔ بھائی شموّ کیا کہوں، گھر والی آٹھ پہر بیمار رہتی ہے جو چار پیسے یہاں سے ملتے ہیں وہ بھی بال بچے کا پیٹ کاٹ کر دوا دارو کے کھینٹ چڑھ جاتے ہیں تم ہی بتاؤ کیا کروں اور کہاں جاؤں (ذرا ٹھہر کر) اگر کہیں سے تنخواہ ملنے تک دو تین روپے ملجاتے تو میری مشکل "کشا" ہو جاتی۔ لے دے کے ایک تم ہی دین داتا نظر آتے ہو اور کہاں مانگنے جاؤں؟"

میں نے چپکے سے دو روپیہ نکال کر اسکے ہاتھ پر رکھ دیئے اور کہا کسی سے

بات نہ کرنا۔ اس نے کہا "میری کیا عقل چنرخ ہو گئی ہے جو لوگوں سے کہتا پھرونگا۔"
اسکے بعد جب میں آگ جلا رہا تھا تو ماما بولی "ارے شمو! سنتی ہوں سرکار سے تجھے پانچ روپیہ کا انعام ملا ہے"

میں۔ ہاں ملا تو ہے۔

ماما۔ تو پھر لا میرا حق!

میں۔ قیمچیاں کھانے کھانے بیٹھ تو میری اُدھڑ گئی۔ اور حق تیرا کہاں سے آ گیا۔

ماما۔ نہ میرا بھائی۔ میں ایک روپیہ تجھ سے قرض کر کے مانگتی ہوں۔ قسم ہے مجھے قرآن پاک کی۔ اگلے مہینے میں دیدونگی۔ تیری بھانجی کئی دن سے ننگے سر پھر رہی ہے اسکے لیے اوڑھنی لاؤں گی

مجھے خوب معلوم تھا کہ اس قسم کے تمام قرض ہمیشہ واجب الادا ہی رہ جایا کرتے ہیں لیکن پھر بھی میں نے ایک روپیہ نکال کر ماما کو دیدیا۔ اور ساتھ ہی کہا "جاؤ اوڑھنی خریدلے، میرا قمیص خواہ پھٹا ہی رہے"

وہ بولی "تجھے کپڑوں کی کیا کمی ہے۔ سرکار تجھ پر مہربان ہیں"

رات کیوقت جب میں اپنی کوٹھری کی طرف جانے لگا۔ تو سقے نے آواز دی "یار شمو حقہ تازہ ہے، اب تو کبھی مل کر بیٹھے ہی نہیں۔ ادھر تو آؤ"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور خاموشی سے اس کے پاس جا بیٹھا۔

سقا۔ (چارپائی سے اُٹھ کر) "ہائے میں مرا"

میں "یار ابھی تمھارے مرنیکے دن بہت دور ہیں۔ کیوں بن آئی کو بلاتے ہو"

سقا۔ ارے ہم تو کہتے ہیں کل کی آئی آج آئے کسی کی آئی ہی لاگ جائے۔

میں. آج گھر میں کچھ کھٹ پٹ ہو گئی ہو گی. ورنہ تم جان سے بیزار ہونیوالے تو نہیں

سقّا. بھائی پانی ڈھوتے ڈھوتے میری پیٹھ دوہری ہو جاتی ہے. اور پاس اتنا بھی نہیں بچتا کہ آدمی گھر والی کے طعنوں ہی سے چھوٹ سکے. اس جئے سے تو مرنا بھلا گور میں کوئی طعنہ دینے تو نہیں آئیگا. اب کل ہی بھائی اور بھاوج آ رہے ہیں. تم ہی کہو گھر میں تو روٹی کا بھی رونا پڑا ہے. انکی خاطر تواضع کہاں سے ہو گی. پہلے تو میں نے کہا تھا. کہیں چند دن کے لیے نکل جاؤں

میں. ہاں بھئی بڑی مشکل ہے.

سقّا. یار کیا بات ہے. اگر کہیں سے دو تین روپئے کا انتظام کر دو. دکھے دکھائے ہی سہی.

میں. قسم ہے مجھے کلام پاک کی جو میرے پاس ایک دمڑی بھی ہو (اپنی پھٹی ہوئی آستین دکھا کر) اگر پاس کچھ ہوتا. تو میرا یہی حال رہتا؟

سقّا. کیوں بھائی ایمان گنواتے ہو، ابھی کریما ماما کا لڑکا کہہ رہا تھا تمہیں سرکار سے بڑا بھاری انعام ملا ہے.

میں. ہاں ملا تو تھا لیکن میرے پاس ٹکنے کون دیتا ہے. اسیوقت ماما اور امیر بخش نے ادھار لے لیا.

سقّا. (غضبناک لہجہ میں) ستیاناس ہو اس کٹنی ماما کا، یہ تو ڈائن ہے ڈائن پیسے کی بو پا لیتی ہے. اور یہ امیر بخش رہ تو جائے افیمچیوں کا انیو بخی، صبح تک اسکی داڑھی کا ایک بال بھی چھوڑ رہا ہو تو بخشو نام نہیں، مجھے معلوم ہیں اس کی کارروائیاں اور تم بھی نرے الّو ہو اصل الّو.

میں بھائی ہیں پردیسی کیا جانوں، اگر تم ذرا پہلے مانگ لیتے، تو مجھے تم سے کون اچھا تھا" سقا بسو برے سے کئی بار بات میری زبان تک آئی، پھر میں نے کہا گھر کی بات ہے ہم تم کوئی غیر تھوڑا ہی ہیں

آخر مایوس ہو کر سقے نے چند ادھر ادھر کی باتیں کرنیکے بعد کہا۔ جاؤ بھائی سو رہو تمھاری آواز نیند سے بھاری معلوم ہو رہی ہے"

میں نے جانتے ہوئے دانستہ طور پر ایک روپیہ وہاں گرا دیا۔ اس بیچارے نے سمجھا۔ بے خبری میں مجھ سے گر گیا ہے۔ اور اس انداز سے اسے اٹھا کر جیب میں ڈالا گویا واجب ہی یہی تھا۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں کسی ضرورت سے مرزا صاحب کے کمرہ میں گیا وہ کہیں باہر تشریف لیجا چکے تھے سامنے میز پر "ٹائمز آف انڈیا" کا تازہ پرچہ رکھا تھا۔ اخبار دیکھے مدت گزر چکی تھی، جسطرح بھوکا آدمی مٹھائی پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالتا ہے، وہی حالت اخبار کو دیکھ کر میری ہوئی۔ آخر ادھر ادھر دیکھ کر اخبار اٹھا لیا ایک انگریز حاکم اور ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر کی دلپذیر اور محققانہ گفتگو نے مجھے ایسا محو کر لیا۔ کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ کب میں پڑھتے پڑھتے مرزا صاحب کی بڑی سی آرام کرسی پر لیٹ گیا تھا۔ اتنے ایک نہایت ہلکی سی آواز سنائی دی" دیکھو دیکھو ادھر کیا ہو رہا ہے"۔ اسکے بعد کسی نے آہستہ سے کہا۔" ہیں یہ تو سچ مچ پڑھ رہا ہے"!

—— پھر کسی نے دبی زبان سے کہا —— " ذرا خاموش تماشا دیکھتے رہو"

صرف ایک لمحہ کے لیے میں ذرا گھبرایا۔ لیکن جلد ہی مجھے تدبیر سوجھ گئی میں نے اسیطرح برابر اخبار پر نظر جمائے ہوئے ایک تصویر کا منہ چڑانا شروع

گردیا، آنکھ ناک اور ہونٹوں سے عجیب عجیب شکلیں بنانے لگا۔ اتنے میں مرزا صاحب کا چھوٹا صاحبزادہ اور دونوں بڑی لڑکیاں مسکراتی ہوئی کمرے میں آگئیں۔ خورشید بولیں "یہ کیا حرکت ہے"؟ میں فوراً کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور تصویر دکھا کر کہا "میں ذرا اس مردوئے کا منہ چڑا رہا تھا۔ بی بی مجھے خدا نے شکل میرے ساتھی کو بھونڈی دی تھی تو کہیں چھپا کر رکھتا نہ کہ لگا ہے اُلٹا اخباروں میں دکھانے گز بشر کرنے"

خورشید۔ "بیوقوف یہ تو کسی ریاست کا راجہ ہے"

مرزا صاحب کا لڑکا ممتاز۔ "ارے بدتمیز یہ تو بتا تجھے ابا جان کی کرسی پر بیٹھنے کو کس نے کہا تھا؟"

میں "رہ میری مجال نہیں، یقین جانو کہ یہ صورت دیکھتے ہی مجھ پر غشی طاری ہوگئی، نہ جانے کہاں چوٹ آجاتی قسمت اچھی تھی جو کرسی پر گرا" اس پر سب ہنس پڑے۔

خورشید۔ "قمو! تجھے کتابوں سے لگاؤ تو بہت ہے لیکن تعجب ہے کہ تو نے پڑھا خاک بھی نہیں"

میں۔ "بی بی اللہ کی قسم مجھے پڑھنے کا بڑا شوق ہے "ٹائمز آف انڈیا" کا پرچہ اٹھا کر (قمر کو مخاطب کرتے ہوئے) بی بی آپ ہماری استاد بنجائیے اور آج ہی سے سبق پڑھانا شروع کر دیجیے۔"

قمر (ہنسکر) واقعی ایسے قابل آدمی کو پہلے پہل "ٹائمز آف انڈیا" ہی سے سبق پڑھنا چاہیئے"

اتنے میں مرزا صاحب کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور سب ادھر اُدھر بکھر گئے۔ اسی طرح ہنسی خوشی یہ دن گزرتے رہے ہنسی مذاق اور کام کاج کی مشغولیتوں کے درمیان قمر کی عادات وخصائل کو پورے غور وفکر سے جانچتا رہا اور اسے بالکل اپنی طبیعت کیلئے موزوں پایا۔ اس کی بھولی بھالی سادہ سی طبیعت جس میں

ذرا سے غور و فکر نے شامل ہو کر اسے اور بھی دلکش بنا دیا تھا میرے مطمئن کرنے کیلئے کافی تھی۔

بالآخر میرے ایما سے ایک عزیز دوست کا خط میرے لیے قمر کی خواستگاری کے متعلق مرزا صاحب کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اپنے مرحوم دوست کے بیٹے کے متعلق مرزا صاحب کو لمبی چوڑی تفصیلات معلوم کرنے کی ضرورت نہ تھی شاید بچپن میں وہ مجھے کبھی دیکھ بھی چکے ہونگے۔ میری شکل و صورت قابلیت جائداد اور چال چلن کے متعلق خط میں میرے وکیل دوست نے "وکیلانہ" وضاحت سے کام کیا تھا۔ اسی روز اس خط کی ایک نقل میرے پاس بھی پہنچ چکی تھی میں گھر کے ایک ایک آدمی کے چہرے پر امید و بیم کی نگاہیں ڈالتا کہ دیکھیں اب تقدیر کیا فیصلہ کرتی ہے۔

مرزا صاحب وہ خط پاکر کچھ مطمئن معلوم ہونے لگے۔ اور بیگم صاحبہ تو عیاں طور پر خوش تھیں بلکہ میں نے انھیں ان کی بڑی صاحبزادی سے یہ کہتے بھی سن لیا کہ "خورشید مجھے اطمینان تو اس بات سے ہے کہ وہاں قمر کی کوئی ساس نند نہ ہو گی ساس نندوں نے تمھاری جو قدر پہچانی وہ کسی سے چھپی ہوئی نہیں"

مجھے یہ سنکر اطمینان ہوا۔ آخر چند دن صلاح مشورے میں گذرے بعض وقت بحث و مباحثہ میں کھانے کو بھی خاصی دیر ہو جاتی۔ اس پر ماما کی تنقید جو نتاً آگر وقتاً فوقتاً گھر کے آدمیوں پر میرے سامنے کیا کرتی بیحد دلچسپ ہوتی۔ آخر چند خطوط آنے جانیکے بعد معاملہ تقریباً طے ہو گیا اور کچھ دن بعد یہ خبر عام طور پر گھر میں مشہور ہو گئی۔ منگنی کی کوئی خاص رسم ادا نہ ہوئی۔ کیونکہ "دولھا والے" شادی کی تاریخ بہت جلد مقرر کرنا چاہتے تھے

اسی دوران میں مجھے ایک اور شرارت کا خیال آیا۔ ایک شام قمر میری

کسی بات پر ہنس رہی تھی میں نے کہا بی بی ہنس لو جتنا جی چاہے۔ آپ تو اب اپنے گھر سدھاریں گی پھر کاہے کو کبھی غریب شمیم کی باتیں آپ کو یاد آنے لگیں۔" قمر بولی "چپ رہ میں ابا جان سے کہوں گی۔"

میں (ہنس کر) "نہیں بی بی سچ کہتا ہوں شمیم صاحب بڑے ہنس مکھ آدمی ہیں میرے ہم وطن ہیں، سب سے پہلے میں انہی کے ہاں ملازم ہوا تھا، ہر وقت ان کے دروازے پر بھانڈ میراثیوں کا مجمع رہتا ہے، نت نئے کھیل تماشے ہوا کرتے ہیں آپ وہاں گئیں تو کبھی ہم لوگوں کو کم ہی یاد کیا کرینگی۔ ان موئی کتابوں کو جن سے آپ ہر وقت مغز ماری کیا کرتی ہیں، ہمارے شمیم صاحب نے کبھی چھوا تک نہیں بس لوگوں کا دل خوش رکھتے ہیں۔"

قمر (گھبرا کر) "ابا جان تجھے پیٹیں گے"

میں "نہ بی بی واسطہ ہے خدا کا کہیں یہی بات نہ کرنا جیسے شمیم صاحب کی صراحی جس میں ان کے پینے کی کوئی کوئی سرخ سرخ چیز تھی ٹوٹ جانے سے ہوئی تھی، اس روز مجھ غریب کو انھوں نے باندھ کر مارا تھا۔"

قمر (حد درجہ پریشان ہو کر) "کیا بکتے ہو؟"

میں۔ "بی بی آپ ناراض نہ ہوں، ایمان کی کہتا ہوں شمیم صاحب بڑے نیک آدمی ہیں نہ نقصان بھی مجھ سے بڑا بھاری ہو گیا تھا، شاید صراحی میں ان کی کوئی دوا تھی۔"

قمر نے مردہ صورت بنائے ہوئے یہ کہہ کر چلی گئی "صراحی میں دوا تیرا باپ ہی رکھتا ہوگا۔" اس کے بعد وہ کئی گھنٹے تک اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی یہاں تک کہ میں بھی گھبرا گیا۔ آخر بیگم صاحبہ نے کہا "خورشید آج قمر کیوں نہیں دکھائی دیتی، دیکھیو تو کہیں اندر کمرے میں تو نہیں گئی۔ تھوڑی دیر بعد خورشید قمر کا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر آئیں۔ اور

ہنسکر کہا۔ "اماں دیکھئے تو نالائق کی حرکت، اندر کمرہ میں تمام تکیہ درد رو کر اس نے بھگو ڈالا ہے"

بیگم صاحبہ۔ "اوئی توبہ رونے سے کہیں درد کم ہوا کرتا ہے بھلا ہاں کیوں نہ بتایا دیکھو تو اسکی بات، اندر اکیلی پڑی روتی رہی (مجھ سے) جا تو تمیزو بھاگ کر ڈاکٹر سے درد سر کی ٹکیہ لیتا آ، (قمر سے) آ میری بیٹی! میں تیرا سر دبا دوں یہ کہہ کر قمر کا سر دبانے بیٹھ گئیں، مجھے ہنسی آگئی۔

درد سر کی ٹکیہ تو میں لے آیا لیکن میں سمجھ گیا کہ درد سر کا صرف بہانہ تھا اور یہ سب میری باتوں کا اثر ہے۔ بیگم صاحبہ سے کہا۔ "بی بی کو ٹکیہ کھانے کیلئے نہ دیجئے، ایک دن میاں نے کھائی تھی تو وہ بہت کمزور ہو گئے تھے، کہتے ہیں کمزوری آدمی پر غشی طاری کر دیتی ہے۔ بی بی کو برف اور سوڈا ملا کر پلا دیجئے بہت جلد آرام ہو جائے گا۔"

بیگم صاحبہ ٹکیہ کو دور پھینکر بولیں "بھاڑ میں جائے ایسی دوا جو غشی طاری کر دیتی ہو"

قمر نے کہا "اماں آپ کے دبانے سے اب مجھے آرام ہو گیا ہے۔"

موقع دیکھ کر میں نے قمر کی موجودگی میں بیگم صاحبہ کے سامنے انکے داماد کی تعریفوں (یا دوسرے الفاظ میں اپنی تعریفوں) کے پل باندھ دیئے۔ بیگم صاحبہ نہال ہو گئیں اور قمر کے دل سے بھی میری ان باتوں کا اثر یا تو بالکل ضائع ہو گیا یا بالکل ہی کم ہو گیا کیونکہ اسکے بعد اسے پھر کبھی درد سر کی شکایت نہیں ہوئی۔

کچھ روز بعد میرے وہی وکیل دوست جو عمر میں مجھ سے بڑے ہونیکے علاوہ کسی دور کے رشتے سے میرے بھائی بھی ہوتے تھے، مرزا صاحب موصوف کے دولتکدہ پر آ پہنچے۔ بظاہر وہ مرزا صاحب سے ضروری معاملات طے کرنے اور شادی کی تاریخ مقرر کرنے کیلئے آئے تھے لیکن انکے آنیکی ایک غرض یہ بھی تھی کہ میں اپنی آئندہ تجویز دل

کے متعلق سب کچھ ان سے زبانی بتا دیا۔ دوسرے شادی کے دن پہننے کے لیے وہ میرے لیے کپڑے وغیرہ اور چند دوسری ضروری چیزیں بھی پوشیدہ طور پر لائے تھے۔

ایک عرصے کے بعد میری اور انکی ملاقات یوں ہوئی کہ وہ اور مرزا صاحب چار بجے باغیچے میں مکلف کرسیوں پر آرام سے بیٹھے باتوں میں مشغول ہیں چائے کی کشتی اُٹھائے ہوئے آیا۔ اس روز میرے کپڑے معمول سے بھی زیادہ میلے تھے، بلکہ آتے آتے راستے میں میں نے ایک دو جگہ سے اپنی قمیص کو عمداً پھاڑ بھی ڈالا۔ میرے پاؤں ننگے اور گرد آلود ہونے کے علاوہ چہرہ پر بھی کہیں کہیں سیاہی کے بے معلوم سے دھبے تھے۔ چائے کی کشتی میز پر رکھکر میں نے جھک کر سلام کیا۔ میرے دوست نے جواب میں نہایت شان سے صرف سر کو ذرا سی جنبش دی لیکن پھر کسی خیال سے ذرا نظر بھر کر میری طرف دیکھا اور فوراً مجھے پہچان گئے انکے چہرہ پر مسکراہٹ دیکھ کر مرزا صاحب بولے "یہ ہمارا ہے ایک نہایت دلچسپ ملازم ہے۔ بعض وقت سوٹ بھی پہنتے ہیں۔"

میری ہیئت کذائی دیکھ کر میرے دوست کا چہرہ ہنسی ضبط کرنے سے سُرخ ہو رہا تھا مرزا صاحب کا یہ کہنا تھا کہ انھوں نے غنیمت جان کر ایک قہقہہ لگایا بلکہ ساتھ تقریباً اچھل بھی پڑے اور بولے "بہت خوب سوٹ بھی پہنتے ہیں" مرزا صاحب نے کہا "جی ہاں" اس پر وکیل صاحب نے خواہ مخواہ دوسرا قہقہہ لگا دیا۔ گویا یہ "جی ہاں" بھی کوئی بڑا لطیفہ تھا تھوڑی دیر بعد مرزا صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "شمو!" میرے دوست نے ہنسنے کا تیسرا موقع حاصل کیا۔ ایک زبردست قہقہہ لگا کر بولے "نام بھی بڑا دلچسپ ہے شمو!" پھر ایک اور قہقہہ لگا دیا میری موجودگی نے وکیل صاحب کی تمام متانت کو بالائے طاق رکھوا دیا مرزا صاحب کی معمولی سے معمولی بات بھی مگر جس میں مذاق کا ذرا شائبہ بھی پاتے بے اختیار ہنس دیتے حتیٰ کہ

بعض جگہ انکی ہنسی مجھے مضحکہ خیز معلوم ہونے لگی اور میں نے مناسب سمجھا کہ وہاں سے ہٹ جاؤں
مرزا صاحب اندر آئے تو بیگم صاحبہ کے سامنے وکیل صاحب کی بذلہ سنجی، وسعت اخلاق، وسعتِ معلومات اور مدلل گفتگو کی بہت تعریف کی پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"نالائق آج تو تو نے اپنی حالت اس قدر ذلیل کیوں بنا رکھی تھی؟"

میں "سرکار اتنا عرصہ حضور کی خدمت میں رہ کر اتنی سی عقل کی بات بھی نہ سیکھتا کہ بڑے آدمیوں کے سامنے بن ٹھن کر جانا بڑی شرم کی بات ہے"

مرزا صاحب کوئی پرانی بات یاد کر کے مسکرانے لگے۔

آخر رات کے وقت جب سب اپنے اپنے کمروں میں سونے کیلئے چلے گئے تو میں چپکے سے اپنے دوست کے کمرہ میں داخل ہوا۔ وہ میرے انتظار میں جاگ ہی رہے تھے میں نے ایک کرسی انکے پلنگ کے قریب کھینچ لی اور بیٹھ گیا۔ وہ ہنسکر بولے "بھئی واللہ اس حالت میں تمھیں اپنے برابر بیٹھے ہوئے دیکھکر تو میں بھی توہین محسوس کر رہا ہوں ۔۔۔ کچھ عرصہ میری موجودگی مضحکہ خیز وضع قطع پر گفتگو ہوتی رہی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر انھیں پہلے ہی سے سب حال معلوم نہ ہوتا تو قطعاً وہ مجھے اس عورت میں نہ پہچان سکتے۔ کہنے لگے۔ "انداز گفتگو کے علاوہ تم نے اپنی شکل و صورت کی طرز بھی کس اعجاز سے بدل ڈالی ہے" ۔۔۔ پھر ہنسکر بولے "موجودہ صورت میں تو مجھے کچھ ناامیدی سی ہو گئی ہے کہ تم پھر کبھی بھی اصل شریفانہ شباہت اختیار کر سکو گے؟ میں نے ہنسکر کہا ع :-

"چناں نماند چنیں نیز ہم نہ خواہد ماند" مطمئن رہئے۔

آخر اصل معاملہ درپیش ہوا۔ ان کا اصرار تھا کہ اب میں یہاں سے چلا چلوں اور میری تجویز یہ تھی کہ شادی کے دن تک یہیں رہوں۔ کیونکہ ان دنوں بیگم صاحبہ رخصت تو مجھے ہرگز نہ دینگی

باقی رہا خود بخود غائب ہو جانا۔ یوں وقت سے پہلے بنے بنائے کھیل کے بگڑ جانے کا کافی اندیشہ ہے۔"

میرے دوست نے ہنس کر کہا: "ارے میاں اصل بات کیوں نہیں کہتے۔ کہ اب یہاں سے شادی کئے بغیر ٹلنے کو جی نہیں چاہتا۔" میں نے مسکرا کر کہا: "ہاں ایک وجہ شاید یہ بھی ہے۔ کیونکہ ایسے دلچسپ موقع زندگی میں بار بار نصیب نہیں ہوا کرتے۔" آخری تجویز یہ ہوئی کہ مجھے گاڑی کے صحیح وقت سے پورے طور پر مطلع کر دیا جائے۔ میں موٹر میں بیٹھ کر ایک دو اسٹیشن آگے پہنچ جاؤں اور وہاں سے بارات کے ساتھ مل کر بحیثیت دولہا کے مرزا صاحب کے دولت کدہ پر پہنچوں۔ میرے دوست کو اس تجویز سے کوئی خاص اطمینان تو نہ ہوا۔ لیکن میرا اطمینان اسی میں دیکھ کر دوسرے روز وہ رخصت ہو گئے۔

شادی کیلئے کل ساز و سامان میرے حسب منشا وکیل صاحب اور انکی بیوی کے اہتمام میں تیار ہو چکا تھا اور اسطرف سے ہم تقریباً پیغام بھیجنے سے بھی پہلے فرصت پا چکے تھے

اب ادھر بھی زور شور سے تیاریاں شروع ہوئیں۔ شادی میں صرف تیرہ بیس روز باقی تھے۔ قمر کا جہیز بھی بڑی حد تک بیگم صاحبہ پہلے ہی تیار کر چکی تھیں۔ اب ہر روز قسم کے جوڑے ٹنکے جانے لگے نئے نئے ساز و سامان خریدے جانے بعض وقت عجیب عجیب رسمیں ادا ہوتیں۔

ادھر مجھے کہیں دم لینے کی فرصت نہ ملتی، گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا۔ اور بیگم صاحبہ کی پر شفقت نگاہ ہر کام کیلئے مجھی کو منتخب کرتی ہیں جب کبھی اور لوگوں کے کام سے فرصت پاتا، تو فوراً قمر کے پاس جا کر کہتا: "بی بی، لائیے آپکا بھی کوئی کام ہو تو کر دوں، آپ بھی کیا یاد کرینگی کہ کوئی شمو ہوا کرتا تھا۔

آہستہ آہستہ وہ دن بھی گذر گئے اور آخر شادی کا دن آ پہنچا۔ شام کے وقت سات بجے برات آنیوالی تھی۔ گھر گھر میں رفتہ رفتہ اندر باہر مہمان جمع ہو رہے تھے لیکن اس روز

بھی بار بار اندر سے بیگم صاحبہ کا بلاوا آتا کہ شمو یہ کر، شمو وہ کر۔ دو گھر کے لوگ برات کے استقبال کے لئے اسٹیشن پر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے، ادھر میرا یہ حال تھا کہ کہیں دم لینے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ آخر چار بج گئے۔ میں ذرا گھبرایا کہ وقت تو ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے اور کام ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آتے۔

اتنے میں قمر کے بڑے بھائی انیا آئے اور کہنے لگے شمو! ذرا میرے سیاہ بوٹ پر پالش تو لگا ڈال۔ میں نے کہا "بہت بہتر سرکار" اور بوٹ لا کر پالش کرنے لگا۔ وہ ہنستے ہوئے بولے "ایسا اچھا پالش کیجیو کہ دولھا والے بھی تمھاری سلیقہ مندی کے قائل ہو جائیں" میں نے کہا "سرکار، خدا نہ دولھا میاں کا بوٹ بھی مات نہ ہو جائے تو شمو نام نہیں۔"

بوٹ ہاتھ سے رکھا نہ تھا کہ ماما چیختی ہوئی آگئی کہ باورچی تیری جان کو رو رہا ہے صبح جو طشتریاں تجھے صاف کرنے کے لیے دی تھیں وہ تو اسی طرح رکھی ہیں۔" میں نے تنگ آ کر کہا "تیرے ہاتھ کہیں ٹوٹ تو نہیں گئے جا مجھے خود بہت کام ہیں۔" ابھی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ مرزا صاحب کی آواز سنائی دی "شمو مہمان خانے کیلئے حقے تازہ کیے یا نہیں؟" جوں توں کر کے میں نے کوئی نصف درجن چلمیں بھری ہوں گی کہ مرزا صاحب کی چھوٹی لڑکی ستارہ آگئی اور بولی "شمو تجھے میری چھوٹی آپا اور بڑی دونوں بلا رہی ہیں۔" میں نے سب کام وہیں چھوڑے اور پچھلی طرف سے قمر کے دروازہ پر پہنچا۔ انکی کلائی کی قیمتی گھڑی جو جہیز میں دیجانے والی تھی کسی شوخ چنچل سہیلی کی بے پناہ شوخی کی نذر ہو گئی تھی مجھ سے کہنے لگیں "کلائی پر سے ایک سنہرا حلقہ ٹوٹ گیا ہے سنار سے جڑوا کر بہت جلد چپکے سے لے آ۔"

میں نے گھڑی جیب میں رکھ لی پھر خورشید ادھر آئیں اور بولیں "شمو اتریا کے بالوں میں باندھنے کا فیتہ پہلے جلدی سے خرید کر مجھے لا دے" پھر پانچ روپیہ کا ایک نوٹ

نکالکر وہاں سن! ننھے کا نیا پوٹ کہیں مہمانوں میں اِدھر اُدھر ہو گیا ہے۔ اسکے پاؤں کا نمبر بتا کر ایک بوٹ بھی لیتے آنا سن لیا؟" میں نے "بہت بہتر" کہکر بھاگنا چاہا کہ ادھر بیگم صاحبہ بھی آنکلیں، مجھے دیکھکر فوراً بولیں "شمّو مجھے تیری ہی تلاش تھی، ذرا بھاگتا ہوا بازار جا اور وہاں سے ایک ٹوکری اچھے اچھے پانوں کی خرید لا۔" میں نے کہا "بہت بہتر سرکار، میں بازار ہی جا رہا ہوں۔" وہاں سے رخصت ہوا تو سامنے پھر میاں امتیاز کھڑے ہوئے ملے۔ مجھسے کہا "شمّو کہاں جاتا ہے؟" میں نے کہا سرکار بازار جا رہا ہوں بہت جلدی کا کام ہے۔" وہ جیب سے کچھ پیسے نکالتے ہوئے بولے "اچھا تو پھر ٹرا شامیانہ باندھنے کیلئے تھوڑی سی ڈوری بھی لیتے آنا۔" میں پھر بھاگنے لگا پھر آواز دیکر بولے "ارے سن جلدی آنا۔ برات اب آیا ہی چاہتی ہے۔" میں نے کہا "ابھی آیا سرکار۔" اپنا پیچھا چھڑا کر پھر بازار کی طرف لپکا۔ اتنے میں پیچھے سے میاں ممتاز کی آواز سنائی دی "ابے شمّو کے بچے! نامعقول! آبا کب سے تیری تلاش کر رہے ہیں اور تو یہاں آرام سے سیر کر رہا ہے" میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا "ابھی آیا!" اور تیزی سے آگے نکل گیا۔

ابھی سنار کی دکان سے حلقہ جڑوا کر نکلا ہی تھا کہ پانچ بج گئے میں نے کہا کہ اب اگر لوٹ کے گھر گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ برات میرے بغیر ہی گھر پر پہنچ جائیگی — باقی چیزیں خریدنے کا ارادہ پہلے ہی سے ترک کر چکا تھا، وہاں سے نکلکر سیدھا اس ہوٹل کی طرف روانہ ہوا جہاں ایک کمرہ میں نے مدت سے خط وغیرہ منگانے کیلئے کرایہ پر لے رکھا تھا، ہوٹل میں پہنچکر غسل کیا۔ اگر میری بات کو مبالغہ نہ سمجھا جائے۔ تو یقین مانئے مجھے منہ دھوئے اُس روز تقریباً ایک ہفتہ گذر چکا تھا نہانے میں خاصہ وقت صرف ہوا۔ اسکے بعد میں نے اپنا نفیس ترین سوٹ پہنا آنکھوں پر چشمہ بھی لگایا۔ اب آئینہ دیکھا تو میرے چہرے کی پہلی

اور موجودہ ہئیت میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ اب کس کی مجال ہے کہ میری نسبت "شمو" ہونیکا خیال بھی دل میں لا سکے۔ ایک مدت کے بعد میں نے پاؤں میں بوٹ پہنا اسکی ایڑیاں خاص طور پر ذرا اونچی دیکھ کر خریدا گیا تھا۔ اب مجھے یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ میرا قد درمیانے کی حد سے گذر کر خاصہ لمبا معلوم ہو رہا ہے۔

جب ہوٹل سے نکلا تو معلوم ہوا کہ وقت بالکل قریب آ پہنچا ہے۔ جلد جلد ایک موٹر کرایہ پر لی جو ہوا کی سی تیزی سے فراٹے بھرتی ہوئی چلی۔

موعودہ اسٹیشن پر پہنچ کر میں نے ٹکٹ خریدا۔ بکنگ کلرک کا خیال تھا کہ گاڑی بہت جلد چھوٹنے والی ہے۔ اور واقعی پلیٹ فارم پر پہنچ کر دفعتہً میری آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ جب میں نے دیکھا کہ گاڑی نہایت سرعت کیساتھ پلیٹ فارم سے نکلی جا رہی ہے میرے دوست گاڑی کی کھڑکیوں سے باہر جھکے ہوئے پریشان نگاہوں کے ساتھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ پلیٹ فارم پر میری تلاش میں نگاہیں ڈال رہے تھے۔ مجھے کچھ نہ سوجھتا تھا۔ بے اختیار میں نے جیب سے رومال نکالکر مایوسانہ انداز میں ہلانا شروع کیا۔ جواب میں کئی ہاتھ ٹوپیاں اور رومال بلند ہوئے۔ ایک لمحہ کے بعد میں سنبھل گیا۔ ہاتھ کے اشارے سے انھیں مطمئن کیا اور دوڑتا ہوا پلیٹ فارم سے باہر نکلنے کی غرض سے واپس مڑا۔ ایک صاحب جو مسکین صورت ملاؤں کی سی وضع قطع بنائے ہوئے سامنے کھڑے تھے خواہ مخواہ میرا راستہ روک کر بولے "صاحب بہادر ذرا میرے ٹکٹ کا نمبر تو پڑھتے جائیے اور بتائیے کس کلاس کا ہے؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا "بکواس مت کیجئے" اور میں بھاگ کر آگے نکل گیا۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ اس بیچارے نے شاید عمر میں پہلی اور آخری مرتبہ تیسرے درجہ کو چھوڑ کر کسی اور درجہ کا ٹکٹ خریدا ہو گا۔ خوش قسمتی سے وہی موٹر سامنے کھڑی ہوئی مل گئی۔ میں اچک

کر اس میں سوار ہو گیا اور شوفر سے صرف یہ کہا "جلدی کرو جلدی"

شوفر "اب کہاں تشریف لے جایئے گا؟"

میں "وہیں، وہیں خدا کے لیے جلدی کرو۔"

شوفر نے مجھے حواس باختہ دیکھ کر خود ہی موٹر کا رخ باہر کی طرف پھیر لیا موٹر چلی تو مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ اور میں نے شوفر سے اپنا مدعا بیان کیا۔ آخر موٹر پھر واپس اسٹیشن کی جانب روانہ ہوئی، جابر ہیری بارات والی گاڑی تیزی سے جا رہی تھی، اب اس گاڑی کو صرف راستے میں ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹھہرنا تھا اور ایک لمحے کی دیر بھی مجھے گوارہ نہ تھی بمنٹ منٹ کے بعد میں جیب سے گھڑی نکال کر دیکھتا، وقت کے ساتھ ہی ساتھ میرا دل بھی اڑا جا رہا تھا۔ ہزار ہا قسم کی بے چینیوں کے علاوہ ایک خیال یہ بھی تھا کہ اگر وقت پر وہاں بھی نہ پہنچا۔ تو میرے دوست مجھے پرلے درجہ کا بے تدبیر، احمق اور کاہل سمجھیں گے۔ میں نے گھبرا کر شوفر سے کہا "تمھاری موٹر کی رفتار گدھے کی چال سے کسی طرح کم نہیں۔"

شوفر "صاحب موٹر تقریباً پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی ہے"۔ میں بار بار مارے اضطراب کے موٹر میں تقریباً اٹھ کر کھڑا ہو جاتا اور کہتا "رفتار جس قدر ہو سکے تیز کرو" شوفر بیچارہ الگ حیران تھا کہ یہ کون پاگل آج میری موٹر میں گھس آیا ہے لیکن میرا یہ حال تھا کہ نشست پر ایک جگہ آرام سے بیٹھنا بھی دشوار تھا، بار بار پہلو بدلتا کبھی اس طرف کبھی دوسری طرف، میں نے ایک بار پھر گھڑی نکالی وقت بہت ہی کم رہ گیا تھا۔ فوراً جیب سے پانچ روپیہ نکالے اور شوفر کی طرف پھینک کر کہا "اور زیادہ انعام ملیگا۔ اگر تم نے رفتار تیز کر دی"۔

شوفر نے رفتار ذرا بڑھا دی جو اس وقت مجھے بہت کم معلوم ہوئی میں نے کہا "دد رفتار ذرا اور تیز کرو ٹریک پر کوئی زیادہ آمد و رفت تو ہے نہیں"۔ شوفر کو شاید میری

بہت مضحکہ خیز معلوم ہوئی۔ ہنس کر بولا "صاحب آپکو جلدی کی وجہ سے شاید معلوم نہیں ہو سکتا، ورنہ سڑک پر تو خاصی آمد و رفت ہے۔ اگر میں نے کہیں ایک دو کا خون کر دیا تو راستے ہی میں رہ جاؤں گا۔"

میں نے بغیر اس کی بات پر غور کئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جس قدر روپئے ہاتھ میں آئے اس کی طرف پھینک کر بولا "کیا تمھاری موٹر کی رفتار ساٹھ پینسٹھ میل فی گھنٹہ نہیں ہو سکتی؟"

اب موٹر آندھی کی سی تیزی سے اڑی جا رہی تھی۔ لیکن غنیمت ہے کہ اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے خیریت ہی گذری اور کوئی خاص حادثہ پیش نہ آیا موٹر سے اتر جانے کے باوجود بھی پلیٹ فارم میں داخل ہونے تک میں اپنی ٹانگوں کو موٹر ہی میں تصور کئے رہا

پلیٹ فارم پر مرزا صاحب کے دونوں صاحبزادے اپنے کئی عزیزوں کی معیت میں براتیوں کے استقبال کے لئے پہلے ہی موجود تھے۔ گاڑی میرے دیکھتے دیکھتے آکر اسٹیشن پر رک گئی غنیمت ہے کہ اس وقت کسی کو اور طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ عین میرے سامنے ایک فرسٹ کلاس کا کمرہ تھا میں "استقبالیہ" کمیٹی سے نظر بچاکر فوراً اس میں داخل ہو گیا۔ میرے پرانے کرم فرما وکیل دوست نے مجھے وہاں داخل ہوتے دیکھ لیا اور بقول ان کے اس وقت ان کی جان میں جان آئی۔

میں پشت پر ہاتھ باندھے ذرا تن کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ تمام عزیزوں کی نگاہیں میری تلاش میں تھیں، جلد ہی وکیل صاحب سب کو میرے درجے کے

سامنے لے آئے۔ مرزا صاحب کے صاحبزادوں اور دوسرے عزیزوں یہ کہہ کر میرا تعارف کرایا "یہ ہیں دولھا میاں بندہ کے عزیز دوست مسٹر شمیم احمد ایم، اے۔"

میرے برادران نسبتی نے عقیدتمندانہ محبت کی نگاہیں میرے چہرے پر ڈالیں اور نہایت پرجوش طریقہ سے مصافحہ کیا۔ عین اسوقت مجھے اُس رسی کا خیال آیا۔ جو چند گھنٹے پیشتر مسٹر امتیاز نے مجھے خیمہ باندھنے کی غرض سے لانے کو کہی تھی۔"

آخر ہم سب موٹر گاڑیوں میں بیٹھ کر مرزا صاحب کے مکان کی طرف روانہ ہوئے میاں ممتاز جو کچھ عرصہ ہوا مجھے مرزا صاحب کی کرسی پر بیٹھے دیکھ کر سخت برہم ہوئے تھے اسوقت نہایت فخر یہ انداز سے میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے جا رہے تھے۔

موٹر سے اترنیکے بعد سب سے پہلی آواز جو میرے کان میں پڑی یہ تھی کہ ماما نہایت فصاحت و بلاغت سے کہہ رہی تھی "اے اور نواور سنا ہے کہ مواابی قمر کی کلائی پر باندھنے والی دو ڈھائی سو کی "کلاک" بھی لے کر غارت ہو گیا۔"

مرزا صاحب مجھے دیکھ کر بیحد خوش ہوئے۔ جوش محبت میں مجھے گلے سے لگا لیا اسوقت مجھے پورا اطمینان ہوا کہ کسی کے دل میں میرے "شمو" ہونے کا شائبہ تک نہیں۔ جو لوگ گھر میں ادھر اُدھر پھر رہے تھے میرے کان انھیں کی آواز پر لگے رہے۔ کوئی کہتا "بھئی وقت پر دغا دے گیا" "کوئی کہتا" دنیا میں کس پہ بھروسہ کیا جائے؟" اور کوئی کہتا "بہتیرا تلاش کیا کہیں اس کا نام و نشان ہی نہیں ملتا"۔ میں سب کچھ سنتا اور دل ہی دل میں مسکراتا۔

اب رات ہو چکی تھی نکاح کے بعد فوراً میری طلبی اندر ہوئی۔ ابھی میں

نے دہلیز میں قدم نہ رکھا تھا کہ بیگم صاحبہ کی آواز سنائی دی، کسی سے کہہ رہی تھیں "یہ ہے کیا کروں، دل نہیں مانتا کہ شمو ایسا دغا باز تھا میرا تو دل دھک دھک کر رہا ہے باہر سڑکوں پر موٹریں اندھی ہوئی پھرتی ہیں۔ کہیں نیچے آ کر خدانخواستہ..........."

اتنے میں۔ میں اندر داخل ہوا سب سے پہلے بیگم صاحبہ کو سلام کیا۔ انھوں نے شفقت سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ اور کرسی پہ بیٹھنے کے لیے کہا مستورات کے درمیان ایک کرسی پہلے ہی اس غرض سے رکھی ہوئی تھی۔ میں قارورے سر جھکا کر وہاں بیٹھ گیا۔ بڑی بوڑھیاں مجھ پر صدقے اور واری ہونے لگیں۔

سب سے پہلے مجھے بیگم صاحبہ نے سلامی دی، اس کے بعد خورشید سامنے آئیں اور کہا "بھیا تم تو لڑکیوں کی طرح زمین پہ جھکے جاتے ہو (ہنس کر) مجھے سلام نہ کرو میں تمھاری بڑی سالی ہوتی ہوں" ساتھ ہی دو اشرفیاں میرے ہاتھ پہ رکھ دیں میں نے انھیں سلام کیا۔ اسکے بعد وہ ذرا دوسری طرف چلی گئیں، ان کا بچہ ابھی تک نئے بوٹ کے لیے مچل رہا تھا۔ بڑے بڑے آنسو اسکے دونوں رخساروں پر اب بھی بہہ رہے تھے۔ وہ اسے جا کر بہلانے لگیں "وہ آیا شمیہ، ننھے کا بوٹ لے کر ابھی شمو آئے گا" میں نے دل میں کہا "اب شمو آچکا"

کچھ دیر بعد میں باہر جانے کے لئے اٹھا۔ خورشید بولیں "بھائی تم بھی کیا یاد کروگے کہ پہلے پہل سالی نے پان تک نہ پوچھا۔ (ہنس کر) بات یوں ہوئی کہ آج ہمارا پان لانے والا چار بجے سے کہیں اللہ کی راہ میں کوچ کر گیا ہے۔ اور ہم اتنے بیٹھے اس کی راہ دیکھ رہے ہیں ذرا دیر ٹھہرو" میں نے دھیمی آواز میں کہا "صبح سہی" اور باہر

کی طرف چلا، لیکن جان بوجھ کر نورا قمر کے کمرے کے قریب آکر رُک گیا۔ اندر سے کسی لڑکی کی آواز سنائی دی "اری خدا کی قسم میں نے پہلے بھی کہیں تیرے دولھا کو دیکھا ہے"

اب صبح با وجود کئی بار بلاوا آنے کے میں اندر نہ گیا۔ کیونکہ مجھے خطرہ تھا۔ کہ کہیں دن کی روشنی میں عورتوں کی تیز نگاہیں مجھے پہچان نہ جائیں۔

آخر قمر کی رخصت کا وقت آن پہنچا۔ گھر بھر کی آنکھوں میں آنسو تھے، لیکن میرا اور میرے دوستوں کا یہ حال تھا کہ بمشکل اپنے سینوں میں قہقہوں کو روکے ہوئے اس انتظار میں تھے کہ کب موقع ملے اور کب ہم یہ ہنسی کا خزانہ کھلے طور پر لٹا سکیں راستہ بھر طرح طرح کے لطیفے ہوتے رہے اور آخر ہم اپنے گھر پہنچ گئے۔ وہاں میرے دوستوں کی بیویاں اور کنبہ وغیرہ کی عورتیں پہلے ہی سے جمع تھیں جنھوں نے قمر کا خیر مقدم نہایت مسرت سے کیا۔

دعوت وغیرہ کے بعد جب مہمان رخصت ہوئے تو میں قمر کے زیور وغیرہ کی فہرست جو مرزا صاحب نے دی تھی، لے کر بیٹھ گیا، اس سے کہا میں آپ کو گنواتا ہوں ذرا دیکھتی جائیے۔ کہ آیا سب زیور ٹھیک ہیں یا نہیں، جب ہاتھوں کے زیوروں کا نام آیا تو قمر شرماتے ہوئے بولی "اس میں ایک کلائی کی گھڑی کم ہو گئی ہے۔ جو میری آپا نے مجھے دی۔ آنے سے ایک دن پیشتر ہمارا ایک ملازم خبیث لے کر معلوم نہیں کہاں چلا گیا۔ شریر بھی بے حد تھا۔ خدا جانے شرارت کے لیے کہیں لے کر نہ بیٹھ رہا ہو"

میں نے نہایت متانت سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کہا لیجیے اپنی گھڑی

ذرا دیکھ لیجئے بسنا دنے تانکا وغیرہ تو ٹھیک لگایا ہے یا نہیں "

قمر۔ (حیرت کے لہجہ میں) "یہ آپ کے پاس کہاں سے آگئی"

میں۔ (چشمہ آنکھوں سے اتار کر تپائی پر رکھتے ہوئے) "اس لئے کہ وہ خبیث ملازم آپ کا یہی خادم ہے"

قمر۔ (غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھ کر) "میرے اللہ یہ کیا معمّا ہے؟"

میں نے تمام واقعات مختصر طور پر اسے کہہ سنائے، وہ بولی، اُف توبہ میں کس طرح یقین کروں"

آخر جب میں نے چند خاص خاص واقعات جو وہاں گذر چکے تھے بیان کئے تو اس نے یقین کیا۔ اور بولی "اُف توبہ! آپ بھی کیسے شریر نکلے۔ خدا کی قسم میں آپکی اس کمبخت صراحی کی بات کا خیال ایکدم کے لیے نہیں بھولی اور اسی لئے میں کل سے آپ کے ہاں کی ہر ایک بوتل کو ذرا غور کی نظر سے دیکھ رہی تھی"

اسکے بعد اس کا اصرار تھا کہ جلد واپس ابا کے ہاں چلو بغیر اس بات کا انتظار کئے کہ مرزا صاحب کے ہاں سے کوئی شخص اسے لینے کے لیے آئے، اب ہم خود ان کی خدمت میں جا رہے ہیں اور جناب یہی ہے عاجز کے "سفر کا اصل مقصد"

یہ کہہ کر شمیم تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔۔۔۔ گاڑی ابھی ابھی۔ اسٹیشن پر آ کر رکی تھی۔

عبدالغفار نے دیوانہ وار پلیٹ فارم پر چھلانگ ماری "ارے بھئی کہاں جاتے ہو خدا کے لیے اتنا تو بتاتے جاؤ۔۔۔۔۔۔